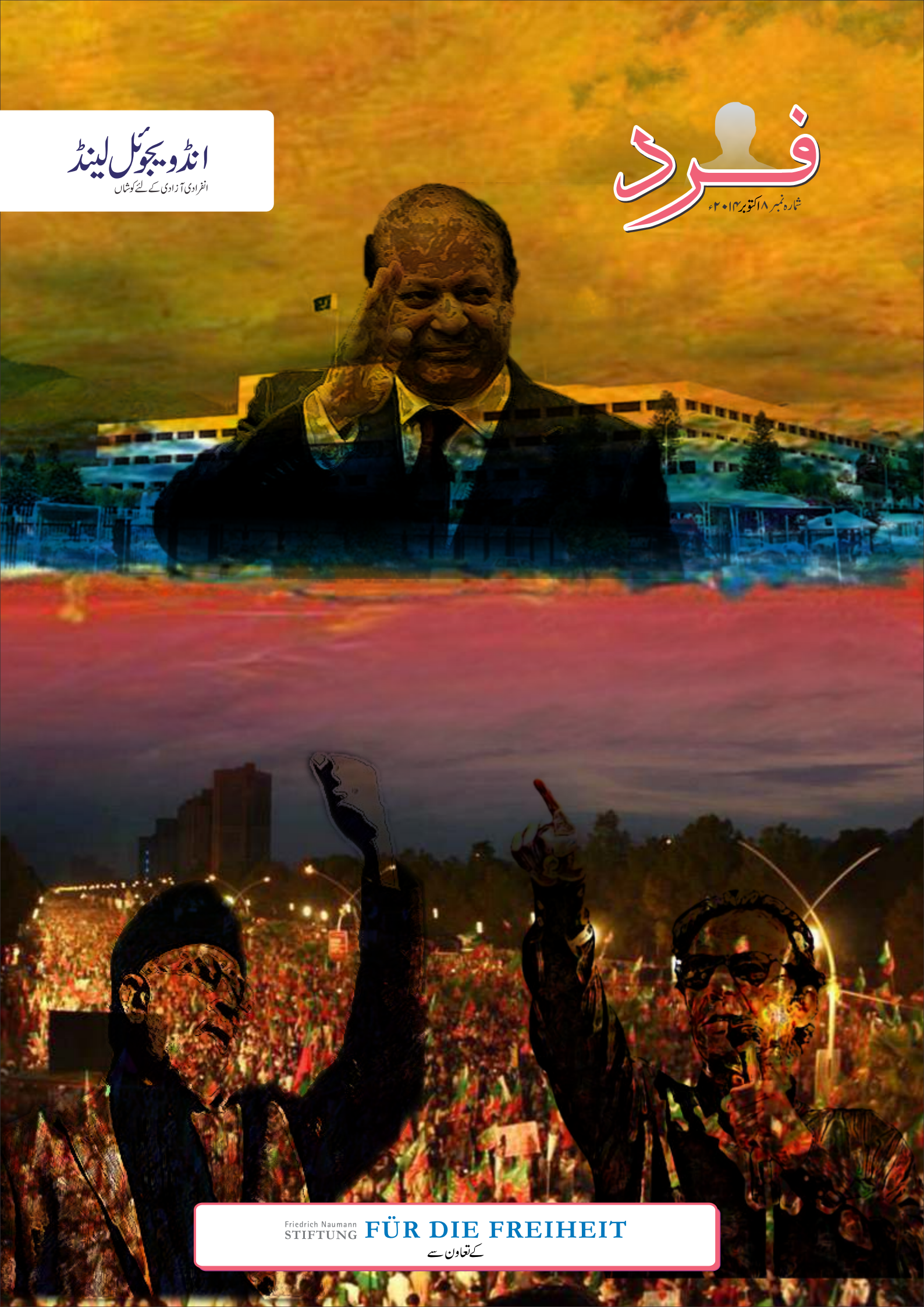

انڈویجوئل لینڈ

انفرادی آزادی کے لئے کوشاں

فرد

شمارہ نمبر ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۴ء

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT

کے تعاون سے

فرد

شمارہ نمبر ۱۸ اکتوبر ۲۰۱۴ء

ایڈیٹر:
سندس سیدہ

کوارڈینیشن: اویس محمود
سید فہد الحسن

کارٹونسٹ:
فاروق قیصر، راکیہ رضاء

ڈیزائین
عدیل امجد، ڈاٹ لائنز

پبلشر:
انڈویجوئل لینڈ پاکستان

آئی ایس بی این ۱ ۳۰ ۹۵۸۲ ۹۶۹ ۹۷۸

فہرست

ایڈیٹر کی میز سے _____ ۱
عجب حالات، غضب کا لانگ مارچ _____ ۲
پاکستان میں موسمیاتی تبدیلی: اثرات اور احساسات _____ ۴
یہ کتنی بڑی "سازش" تھی؟ _____ ۷
اہم مسائل اور حکومت کی عدم توجہ _____ ۱۱
ضربِ عضب: ایک نیم دلانہ اور مشکوک کاروائی _____ ۱۴
کیا خبر بکتی ہے؟ _____ ۱۷
میڈیا اور دھرنا _____ ۲۰
سیلاب اور منصوبہ بندی _____ ۲۳
یہ کس کا لانگ مارچ تھا؟ _____ ۲۶
قبائلی خواتین: چادر اور چاردیواری سے سڑکوں پر _____ ۲۸
انتباہ: یہ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے _____ ۳۱
خواتین معاشرے کی ڈرائیونگ فورس _____ ۳۳
سیاست اور نوجوان _____ ۳۶
شہیدِ صحافت: ارشاد مستوئی _____ ۳۸

Individualland
Creating space for the individual
نمبر ۱۲۔ بی، سٹریٹ نمبر ۲۶، سیکٹر ایف ۸/۱، اسلام آباد

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

ایڈیٹر کی میز سے

پیارے قارئین!

ہمارا پیارا ملک پاکستان موجودہ حالات میں بے شمار مسائل سے دوچار ہے۔ ایک طرف تو ہمیں قدرتی آفات کا سامنہ ہے جو ہمارے سروں پر موت کا سایہ بن کر منڈلا رہی ہیں اور دوسری طرف ملک کے سیاسی حالات ایک ایسے موڑ پر آ چکے ہیں کہ سیاسی قوتیں انہیں جمہوریت کیلئے خطرہ قرار دے رہی ہے۔ پاکستان کو تحفظ فراہم کرنے والے ادارے بھی مُلک میں موجود عسکریت پسندوں کے خلاف جنگ لڑنے میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ اگر ملک میں جنگ اور تعصب کی صورتحال پر بات کی جائے تو شمالی وزیرستان کے متاثرہ افراد کا ذکر کرنا نہایت اہم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ پورے ملک کی خاطر اپنے گھر چھوڑ کر جھونپڑیوں میں رہ رہے ہیں اور اپنی ثقافت اور رسم و رواج کے خلاف زندگیاں گزارنے پر مجبور ہیں۔

فرد کے اس شمارے میں ہم نے کوشش کی ہے کہ موجودہ صورتحال میں میڈیا کے کردار پر روشنی ڈالیں اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ہمارا میڈیا کتنا اہم، غیر جانب دار، اور متوازن کردار ادا کر رہا ہے؟ کچھ لکھاریوں کے خیال میں چند مسائل ایسے بھی ہیں جن کو میڈیا میں اتنی اہمیت نہیں دی گئی جیسا کہ متاثرین کی بحالی۔ اس شمارے میں آپ موجودہ حالات میں میڈیا کے کردار کے علاوہ شمالی وزیرستان میں جاری فوجی آپریشن اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور ماحولیاتی تبدیلیوں کے ملک پر اثرات کے بارے میں جان پائیں گے۔ اس کے علاوہ موجودہ صورتحال میں حکومتی اداروں کے کردار اور اٹھائے جانے والے اقدامات اور دیگر توجہ طلب مسائل پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سوشل میڈیا کے کردار کے حوالے سے بھی مضمون تحریر کیا گیا ہے اور عوام کی دھرنوں اور احتجاج میں دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس حوالے سے بھی مضامین شامل کئے گئے ہیں اور خصوصی طور پر میڈیا کے غیر جانبدار کردار پر بات کی گئی ہے، کہ کیا میڈیا غیر جانبدار کردار ادا کر رہا ہے؟ اور اگر ہاں تو کس حد تک؟ تا کہ فرد کے پڑھنے والوں میں میڈیا کے کردار کے حوالے سے آگاہی پیدا کی جا سکے۔

اگلے شمارے تک اجازت دیجئے

سندس سیدہ

عجب حالات، غضب کا لانگ مارچ

اکرام ہوتی

پاکستان میں لانگ مارچز کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایک حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی بدولت نا صرف سیاسی اور انتظامی بحران کا سامنہ کرنا پڑتا ہے بلکہ حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے سیاسی قوتیں سرگرم ہوجاتی ہیں۔ جس سولین حکومت کے دور میں لانگ مارچ ہوا، اس کے فوج کے ساتھ تعلقات بحرانی شدت اختیار کرتے نظر آئے اور اس کی انتظامی قوت کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی۔ یہی بحرانی شدت اور انتظامی کمزوری آج بھی ہمارے سامنے ہے۔

لانگ مارچ کی تاریخ میں ہمیں صرف یہی تکلیف دہ پہلو نہیں ملتا۔ بلکہ یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ لانگ مارچ "تبدیلی" کے نعرے سے شروع ہوئے، لیکن انہیں سول سوسائٹی کی حمایت کبھی حاصل نا ہوسکی۔ ان لانگ مارچز کے باعث سول حکومت کی تبدیلی کے حالات تو بنے، لیکن جن حالات کو تبدیل کرنے کے لئے لانگ مارچ کا نعرہ بلند ہوا، وہ کبھی تبدیل نہ ہوئے۔ جتنا بھی سیاسی ابھار پیدا ہوا، اس کا فائدہ اسٹیبلیشمنٹ کی مزید تقویت کا باعث بنا جس کی بنیادی وجہ سیاسی قوتوں کی کمزوری ہے۔

لہذا یہ امر سامنے رہے کہ ماضی کا ہر لانگ مارچ عوام کے سیاسی جذبات میں ہیجان ضرور پیدا کرتا رہا۔ لیکن تبدیلی کی صورت میں اس کا ثمر عوام کو نہ ملا بلکہ فائدہ کوئی اور اٹھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ لانگ مارچ پاکستان میں ایک مشکوک سیاسی سرگرمی بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود لانگ مارچ کے حربے کو استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس مشکوک سرگرمی میں استعمال ہونے والے سیاسی مہروں نے کبھی سول سوسائٹی کی لیڈرشپ کو جگانے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان سیاسی مہروں کو وقتی فائدہ ضرور ہو، لیکن وہ مشکوک سیاسی قوت بن کر اپنے آپ کو حقیقی سیاسی عوامی قوت کا نمائندہ بنانے میں ناکام ہوتے رہے۔

اگست تا ستمبر ۲۰۱۴ء کے لانگ مارچ کا ایک نیا پہلو مدنظر رہے کہ اس میں علامہ قادری کی نیم شہری اور دیہاتی قوت بھی سرگرم رہی اور تحریک انصاف کا آزاد خیال شہری جھتہ بھی رقص موسیقی کے ساتھ سیاست کے نئے رنگ بکھیرتا رہا۔ کچھ لوگوں نے اس امر کا بھی نوٹس لیا کہ عمران خان وزیراعظم بننے کو بیتاب لگے، جبکہ علامہ طاہر قادری نے پاکستان کو ایک ایسا ملک بنانے کا کچھ ایسا خواب کتابوں اور روایات سے نکال کر مجمع میں بکھیر دیا "جہاں انصاف ہوگا، بادشاہت کی بجائے حقیقی جمہوریت ہوگی، غربت کا خاتمہ ہوگا۔ پاکستان کے نظام سے نئی امیدیں وابستہ ہونگی"۔ جو لوگ عمران خان کے "نئے پاکستان" اور طاہر قادری کے "خوشحال پاکستان" کے نعروں سے مرعوب ہوئے انہیں بھی یہ دھڑکا لگا رہا کہ کہیں ان نعروں کے شور میں جوتوں کی چاپ تو بلند ہونا شروع نہیں ہو جائیگی! ماضی میں ایسے خدشات حقیقت بن جایا کرتے تھے۔ ۱۹۷۷ میں (پی۔این۔اے) کی تحریک کے بطن سے ضیاءالحق کا مارشل لاء نمودار ہوا۔ پھر ذوالفقار علی بھٹو کو عدالت کے ذریعے سزائے موت دلوائی گئی، جسے بڑے بڑے قانون دانوں نے عدالتی قتل قرار دیا۔ یوں پاکستان کی تاریخ میں سیاسی قتل مقاتلے سیاسی بحرانوں کے نتیجے کے طور پر سامنے آئے۔

نواز حکومت کے خلاف لانگ مارچ اور دھرنا شاید ملکی تاریخ میں سب سے نمایاں سیاسی مظاہرہ ہے۔ اور شاید یہ سب سے بڑے سیاسی اور انتظامی بحران کا مظہر بھی ہے۔ شاید سول حکومت اور اسٹیبلیشمنٹ کے درمیان مخاصمت اور انتظامی کمزوری کا فائدہ اٹھانے کی یہ سب سے بڑی کوشش تھی۔ مقصد ایک ہی تھا کہ نواز حکومت کو اس حد تک گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جائے کہ استعفیٰ دے دے۔

"نیا پاکستان" اور "انقلابی پاکستان" کے نعروں کو سیاسی اہمیت نہ ملی۔ اس باعث سول سوسائٹی کی لیڈرشپ میں بھی ابھار نہیں آیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ماضی کے لانگ مارچوں کی طرح یہ بھی ایک محدود مقاصد والی سرگرمی بن کر رہ گئی۔ اس سرگرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے والی قوتیں اور ملک کی عوامی سیاسی قوت، عرصہ دراز سے پاکستان میں دو ایسے فریق ہیں جن کی سمتیں مخالفانہ ہیں۔

عوامی سیاسی قوت شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ منسلک ہوئی۔ پھر پاکستان کے ٹوٹنے اور بھٹو کے قتل کے بعد اس نے اپنے جوہر دکھانا بند کر دیئے۔ سیاسی اور انتظامی بحرانوں کے نتیجے میں ابھرنے والے لانگ مارچوں سے فائدہ اٹھانے والی قوت کو اس نے پھر کبھی چیلنج نہیں کیا۔ عمران خان اور طاہر القادری کے لانگ مارچ اور دھرنے اور پی۔این۔اے کے ۱۹۷۷ء کے لانگ مارچ میں کوئی سیاسی فرق نہیں۔ البتہ یہ فرق ہوسکتا ہے کہ اب سیاسی قوتوں کو دبانے کے لئے مارشل لاء کی بجائے کوئی اور طریقہ نکالا جائے۔ اور شاید اس بار سیاسی قوتوں پر پہلے سے زیادہ سختی کر دی جائے۔

سابق صدر جنرل مشرف کا ایک بیان ۲۶ ستمبر ۲۰۱۴ء کو اے آر وائی چینل پر سامنے آیا، جس میں انہوں نے کہا کہ جب نیب کا ادارہ بنایا گیا تو اس کی کارکردگی تین بڑے عوامل کے باعث متاثر ہوئی، اول تاجروں نے خوف کے باعث سرمایہ بیرون ملک منتقل کرنا شروع کر دیا۔ دوئم بیوروکریسی نے اہم فیصلے کرنا چھوڑ دیئے۔ سوئم بنکوں نے قرضے دینا بند کر دیے۔ انہوں نے کہا کہ ایسی صورتحال میں حقیقت پسندی کا تقاضا تھا کہ سیاسی قوتوں پر سختی نا کی جائے۔ جس قسم کے بیانات عمران خان اور طاہر القادری نے اپنی تقاریر کے دوران ڈی چوک اسلام آباد کے دھرنے میں دیئے، ان سے یوں ظاہر ہوا کہ کہ فوج آنے والی ہے اور سیاستدانوں کے ساتھ سختی ہونے والی ہے۔ لانگ مارچ اور دھرنے کے عمل نے عوام کو تین مختلف سمتوں میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے، اول وہ لوگ ہیں، جو یہ خیال کرتے ہیں، کہ اگر سیاستدانوں پر سختی کرانے کے لئے لانگ مارچ اور دھرنا منعقد کیا گیا تو یہ فیصلہ کس کا تھا؟ اور اس کے لئے لانگ مارچ اور دھرنے کے ذریعے حکومت کو ہٹانا یا دبانا کیا ضروری تھا؟ دوئم وہ لوگ، جو یہ سوچتے ہیں، کہ لانگ مارچ اور دھرنے کے پیچھے صرف یہ منصوبہ ہے کہ ڈرا دھمکا کر نواز شریف کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا جائے۔ تیسرے وہ لوگ، جو یہ سوچتے ہیں، کہ عمران خان کا "نیا پاکستان" اور طاہر القادری کا "انقلابی پاکستان" محض سہانے خواب نہیں ہوسکتے، ضرور اعلیٰ دماغوں نے پاکستان کے نظام کو تبدیل کر دینے کا سوچا ہوگا۔

لانگ مارچ اور دھرنے کا یہ اثر ضرور ہوا کہ ان تین سمتوں میں عوامی سوچ کا عمل شروع ہوا ہے۔ درحقیقت کیا ہونے والا ہے اس بارے میں بے یقینی عام ہے۔ لہذا یہ نتیجہ اخذ کرنا دانشمندی سے قریب تر ہوگا کہ لانگ مارچ اور دھرنے کا منصوبہ جس مقصد کے لئے بھی ہو، عوام میں اس سے بے یقینی کا احساس پہلے سے زیادہ جاگزیں ہوا ہے اور یہ کوئی خوش آئند بات نہیں۔ اس بے یقینی کا فائدہ صرف عوام دشمن اور تخریبی قوتوں کو ہوگا۔ بے یقینی کے مارے نوجوانوں کو تخریب اور آمریت کے حق میں زیادہ آسانی سے مائل کیا جا سکتا ہے۔

بہت سے ذہنوں میں یہ سوال بھی ابھرا ہے کہ آیا لانگ مارچ اور دھرنے والے دہشت گردوں کے حملوں سے محفوظ ہیں اور اگر ہیں تو کیونکر؟ دوسری جانب یہ خیال بھی ظاہر کیا جا تا رہا ہے کہ یہ لانگ مارچ اور دھرنا دہشت گردوں کو ترغیب دے رہا ہے کہ پاکستان کا دارالخلافہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا اور اس پر حملہ کرنے کے لئے کوئی زیادہ قوت درکار نہیں۔ لیکن یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ دہشت گردوں کے دھماکوں کے خلاف ڈاکٹر قادری نے فتویٰ جاری کیا تھا لیکن پھر بھی ان کے دھرنے میں موجود لوگ دہشتگردی سے محفوظ ہیں، ایک عام آدمی کے ذہن میں اسکی دو وجوہات آتی ہیں ایک تو یہ کہ فوج کا کیا گیا آپریشن کامیاب ہو چکا ہے یا پھر یہ کہ دہشتگرد عناصر کہیں اور مصروف ہیں۔

مصنف نے اپنے ۳۵ سالہ صحافیانہ کیریئر کے دوران کاونٹر ٹیررازم ٹیکس رپورٹنگ اور دیگر اقتصادی و سیاسی موضوعات پر کام کیا۔
اس میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

پاکستان میں موسمیاتی تبدیلی:
اثرات اور احساسات

ذوالفقار حیدر

مجھے ۱۳ اور ۱۴ ستمبر، ۲۰۱۴ کو لاہور کے ایک مقامی ہوٹل میں انڈو بیجوئل لینڈ پاکستان کی جانب سے صحافیوں میں موسمیاتی تبدیلی پر شعور اجاگر کرنے کے لئے منعقدہ ایک ورکشاپ میں ریسورس پرسن یا ٹرینر کے فرائض انجام دینے کا موقع ملا۔ اس ورکشاپ میں لاہور سمیت گجرانوالہ، ملتان اور کوٹ ادو سے تعلق رکھنے والے صحافیوں نے شرکت کی۔ جب میں نے ٹرینر کے فرائض انجام دینے کی حامی بھری تو مجھے یہ احساس تھا کہ ورکشاپ کا موضوع سیاست کی طرح چٹ پٹا نہیں ہے تو کہیں یہ نا ہو کہ یہ صحافیوں کی بوریت کا باعث نا بن جائے اور یقیناً آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے ماحول میں دو (۲) دن گزارنا شرکاء اور ٹرینر دونوں کیلئے کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اسی الجھن میں میں اپنے ساتھیوں سمیت لاہور پہنچ گیا۔ ۱۳ ستمبر کی صبح ہوئی تو میں اور میرے ساتھی ٹریننگ ہال میں پہنچ گئے اور شرکاء کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ صحافی ہال میں پہنچنا شروع ہو گئے۔ شرکاء میں شامل چند صحافی پہلے بھی ہمارے پروگراموں میں شرکت کر چکے تھے۔ جب سب شرکاء نے اپنی نشستیں سنبھال لیں تو میری ساتھی نے ورکشاپ کا باقاعدہ آغاز کیا اور انڈو بیجوئل لینڈ کی جانب سے سب ساتھیوں کا تعارف کروایا۔ اس کے بعد شرکاء نے اپنا اپنا تعارف کروایا اور پھر میری ساتھی نے ورکشاپ مجھے سونپ دی۔ میں نے اپنی پریزنٹیشن شروع کی اور شرکاء کو موسمیاتی تبدیلی کے بنیادی تصورات کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

سچ پوچھیں تو سب شرکاء کے چہروں پر حیرانی دیکھ کر میں کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں جو کچھ بول رہا ہو وہ ان سب کے سروں کے اوپر سے گزر رہا ہے۔ البتہ خدا خدا کر کے میں نے اپنے پہلے سیشن کا اختتام کیا اور میری ساتھی نے ورکشاپ کا انتظام سنبھال لیا۔ میں تو یہی توقع کر رہا تھا کہ ابھی ایک صحافی اٹھے گا اور کہے گا کہ آپ نے ہمیں یہ کیا سنانے کیلئے بُلا لیا ہے۔ میری ساتھی نے شرکاء سے سوال لینا شروع کیے تو جیسے میری جان میں جان آنا شروع ہو گئی۔ چونکہ پاکستان میں حال ہی میں سیلاب نے تباہی مچائی ہے اور میں نے بھی اپنی پریزنٹیشن میں اس پہلو پر روشنی ڈالی تھی، اسلئے پہلا سوال بھی اسی حوالے سے پوچھا گیا۔

سیلاب اور موسمیاتی تبدیلی کے تعلق پر روشنی ڈالیں تو یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ سیلاب ایک قدرتی آفت سے کم نہیں، مگر ہم یہ کہہ کر اس الزام سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے۔ یقیناً بہت سے ملکوں نے سیلاب اور ایسی دوسری قدرتی

آفات کو قابو کر کے دکھایا ہے۔ آخر اچانک یا یک دم رونما ہونے والی یہ تبدیلیاں انسان کے ہاتھوں پھیلائی گئی ماحولیاتی آلودگی کا ہی نتیجہ ہیں۔ پاکستان کے شہری ہونے کے ناتے ہم اپنے فرائض ادا نہیں کر رہے۔ ہماری گاڑیاں دھواں دیتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے نا صرف ہمارا ماحول آلودہ ہو رہا ہے بلکہ انسانی جان سمیت پودوں اور جانوروں پر بھی اس کے برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ہم اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ بھی باہر پھینکتے ہیں اور غرضیکہ ہم ایسا کوئی کام نہیں کرتے جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہمیں اپنے ماحول کی کوئی پرواہ ہے۔ اب اگر سیلاب پر بات کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کتنے ہی پراجیکٹس ہم نے اپنے ذاتی مفادات کی نظر کر دیے جن سے ہمارے ملک کو فائدہ ہونا تھا۔ چلیں کالا باغ ڈیم نہیں بن پایا تو اور ایسے بہت سے چھوٹے بڑے ڈیم بنائے جا سکتے تھے جن کی مدد سے اضافی پانی کو جمع کر کے آبپاشی اور بجلی بنانے کے کام لایا جا سکتا تھا۔ پاکستان پوری دنیا کی گرین ہاؤس گیسس کا صرف اشاریہ سات فیصد پیدا کرتا ہے جب کہ اسے موسمیاتی تبدیلی سے بے حد نقصان ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو گلیشیئر پگل رہے ہیں جس سے دریاوں میں زیادہ پانی آجاتا ہے جو بعض اوقات سیلاب کا باعث بنتا ہے اور دوسری طرف بے وقت اور بے تحاشہ بارشوں کی وجہ سے ہمارے دریا بھر جاتے ہیں اور آبپاشی کے نظام اور بڑے شہروں کو بچانے کی خاطر یہ پانی دیہاتوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے نا صرف مالی اور جانی نقصان ہوتا ہے بلکہ غریب عوام غریب سے غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ جب بھی انسان قدرتی توازن کو خراب کرتا ہے تو وہ اپنے لئے ہی مصیبت پیدا کرتا ہے اور حالیہ سیلاب بھی اسی کا نتیجہ ہیں۔

موسمیاتی تبدیلی کے بارے شعور اجاگر کرنے میں صحافیوں کے کردار کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں یہ کہا گیا کہ صحافیوں کو یہاں مدعو کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ انہیں موسمیاتی تبدیلی کو اپنے ایجنڈے میں شامل کرنے پر راضی کیا جا سکے۔ صحافیوں کا کہنا تھا کہ ہم اپنی مرضی سے ایسے موضوعات کو اپنے ایجنڈے میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ آج کل

تجارتی فوائد ہی ایک اخبار یا چینل کے ایجنڈے کا فیصلہ کرتے ہیں اور شاید ہی کوئی اخبار یا نیوز چینل ہو جس میں ماحولیات یا اِس سے ملتی جلتی کوئی بیٹ ہو۔ یقیناً ماحولیاتی آلودگی یا موسمیاتی تبدیلی سیاست کی طرح چٹ پٹے موضوعات نہیں ہیں مگر نا صرف عوام بلکہ حکومت اور دیگر اداروں میں یہ احساس اجاگر کرنا بہت ضروری ہے کہ اگر ماحول میں کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو اِس کی ذمہ داری ہم سب پر آتی ہے۔

حالیہ سیلاب نے پاکستانی ریاست اور شہریوں کا شاید عربوں روپے کا نقصان کر دیا ہو۔ مزید یہ کہ لوگوں کے جانور مر گئے، کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں اور جانی نقصان الگ ہوا۔ آنے والے چند ماہ تو کیا چند سالوں میں بھی شاید اس نقصان کا ازالہ نا ہو پائے۔ غریب کی بحالی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ میرے خیال

میں کوئی بھی تجارتی فائدہ اِس نقصان کو نظر انداز کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلے میں صحافیوں کا کردار سب سے اہم ہے کیونکہ صحافی ہی شہریوں کی آراء کی تشکیل کرتے ہیں اور اگر یہ احساس اجاگر کر دیا جائے کہ ہمیں موسمیاتی تبدیلیوں کو روکنے کے لئے اپنے روزمرہ کے طور طریقے بدلنا ہوں گے تو یقیناً میڈیا صحیح معنوں میں اپنا کردار ادا کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

ورکشاپ کے دوسرے دن کے آغاز میں موسمیاتی تبدیلی کے اثرات اور اِن سے بچاؤ پر ایک ڈاکیومنٹری دکھائی گئی۔ اِس ڈاکیومنٹری کا مقصد جہاں موسمیاتی تبدیلی سے ہونے والے نقصانات کا احاطہ کرنا تھا وہیں حکومت اور شہریوں کو ماحول کو بچانے کی خاطر اقدامات اٹھانے پر توجہ دلوانا بھی تھا۔ اِس ڈاکیومنٹری میں خصوصی طور پر رینیوایبل انرجی پر بات کی گئی۔ رینیوایبل انرجی یا توانائی اُن ذرائع سے پیدا کی جاتی ہے جو استعمال سے کم یا ختم نہیں ہوتے جیسا کہ ہوا، سورج کی روشنی، پانی یا زمین کی گرمی وغیرہ۔ مزید، پاکستان میں رینیوایبل توانائی کو اپنانے کے سلسلے میں ہونے والی کوششوں کا احاطہ بھی کیا گیا۔

اِس ورکشاپ میں جناب سردار وقاص موکل، ممبر پنجاب اسمبلی نے بھی شرکت کی اور حال ہی میں جرمنی میں موسمیاتی تبدیلی پر ایک ایکسپوژوزٹ کے بارے میں شرکاء کو آگاہ کیا۔ انہوں نے جرمنی کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'فلڈ ہائم' کا ذکر کیا جو اپنی تمام تر توانائی کی ضروریات خود پورا کر رہا ہے اور نا صرف یہ بلکہ نیشنل گرڈ میں بھی اپنا حصہ ڈال رہا ہے۔ جرمنی نے فوکوشیما، جاپان میں سونامی کے نتیجے سے تباہ ہونے والے جوہری پاور پلانٹ سے فوراً سبق حاصل کیا اور مرحلہ وار اپنی توانائی کی ضروریات کو رینیوئیبل ذرائع پر شفٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں جرمنی میں ہوا سے چلنے والی ٹربائنیں اور شمسی پینلز لگائے گئے ہیں اور نا صرف یہ بلکہ بائیو ویسٹ سے بھی بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ حالانکہ جرمن شہریوں کو یہ احساس ہے کہ ان ذرائع سے پیدا ہونے والی توانائی مہنگی ہوگی مگر اپنے ماحول کی بہتری کیلئے ہے وہ یہ کڑوا گھونٹ پینے کو تیار ہیں۔

یقیناً پاکستان اور جرمنی کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر یہ ماحول اور آب و ہوا ہم سب کیلئے مشترک ہے۔ پاکستان میں شمسی توانائی، ہوا اور بائیوگیس کے استعمال کو فروغ دینا اِس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں اِن ذرائعوں سے بجلی پیدا کرنا نا صرف ممکن ہے بلکہ ہم اپنی ضروریات کو پورا کر کے اضافی بجلی کو برآمد بھی کر سکتے ہیں۔ حکومتی سروے سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پاکستان میں صرف پانی سے تقریباً ۴۵،۰۰۰ میگا واٹ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے جبکہ سورج سے دو اشاریہ تین ملین میگا واٹ اور ہوا سے تین لاکھ چھیالیس ہزار میگا واٹ بجلی پیدا کرنا ممکن ہوسکتا ہے۔

موسمیاتی تبدیلی پر شعور اجاگر کرنا اور رینیوئیبل توانائی کے ذرائع کے استعمال کو فروغ دینا ضروری ہوتا جا رہا ہے خصوصاً اِن حالات میں جب ہم اپنی توانائی کی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ البتہ ایک صحافی نے یہ سوال ضرور اٹھایا کہ اِن تمام ذرائع سے توانائی کا حصول ایک عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہے کیونکہ اس سلسلے میں ضروری آلات کافی مہنگے ہیں۔ یقیناً صحافیوں کو مدعو کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اگر صحافی حکومت پر دباؤ بڑھائیں کہ رینیوایبل توانائی کے آلات پر ٹیکس کی چھوٹ دی جائے تو یہ عام آدمی کی پہنچ میں آجائیں گے اور حکومت پر بوجھ بھی کم ہوجائے گا، تو بھلائی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

ورکشاپ کے اختتام پر بائیوگیس کے فوائد پر ایک ڈاکیومنٹری دکھائی گئی اور پاکستان میں سرکاری اور نجی سطح پر ہونے والے اقدامات کا ذکر کیا گیا۔ صحافیوں نے اپنے عزائم کا اظہار کیا کہ وہ واپس جا کر اپنے اپنے علاقوں میں موسمیاتی تبدیلی پر شہریوں میں شعور اجاگر کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ صحافیوں کے عزائم کے بارے میں جان کر نا صرف خوشی ہوئی بلکہ یہ تسلی بھی ہوئی کہ دو دن کی یہ کاوش کامیاب رہی۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں سینیئر پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

یہ کتنی بڑی "سازش" تھی؟

اکرام ہوتی

لانگ مارچ اور دھرنے کے بعد تیسرے ہی ہفتے میں یہ احساس تیزی سے ابھرنے لگا، کہ جمہوریت کے خلاف ایک تحریک کھڑی کر دی گئی ہے۔ گو اس تحریک میں عوام کو سیاسی دنیا کے بارے میں بہت سی تازہ معلومات حاصل ہوئی، کچھ ذرائع کا یہ خیال تھا کہ یہ "پہلا وار" تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری دھرنے کے چوتھے ہفتے میں بھی یہ تکرار کرتے رہے، کہ وہ دھرنا کسی صورت ختم نہیں کریں گے جب تک وزیر اعظم نواز شریف استعفیٰ نہیں دے دیتے۔

حکومت کی انتظامی صلاحیت زنگ آلود نظر آئی، لیکن اس کی سیاسی بصیرت دھرنے کے دوسرے ہفتے جاگتی محسوس ہوئی جب اس نے پارلیمان کا مشترکہ اجلاس بلایا۔ اسی اجلاس میں سینیٹر رضا ربانی نے ایک چونکا دینے والا بیان دیا۔ انہوں نے کہا "اٹھارویں آئینی ترمیم کے ذریعے اسمبلیاں صدر کے ذریعے تحلیل کرنے کا اختیار ختم کر دیا گیا ہے۔ لہذا ہوشیار رہیے۔ اب جمہوریت پر شب خون مارنے والوں کے پاس ایک ہی راستہ بچا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پر اکسی قوتوں کے ذریعے احتجاجی سرگرمیوں کو منظم اور مرتب کریں"۔ عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری کے بارے میں سینیٹر رضا ربانی کے اس جملے میں ایک واضح تنبیہہ تھی۔

پر اکسی احتجاجی قوتیں دو قسم کی ہیں۔ دونوں کا ذکر رضا ربانی نے اپنے تشریحی بیان میں کیا۔ ایک سپریم کورٹ ہے، جس نے وزیر اعظم گیلانی کو چلتا کیا۔ دوسری پر اکسی چھوٹی سیاسی جماعتیں ہیں۔ جن کے ذریعے احتجاجی سرگرمی کو تعاون ملتا ہے۔ عمران خان، ڈاکٹر قادری اور گجرات کے چوہدری برادران کے بارے میں یہ تاثر عام ہو رہا ہے۔ نجم سیٹھی نے جیو کے پروگرام "آپس کی بات" میں ۵ ستمبر ۲۰۱۴ کو کہا، کہ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ سیاسی حکومت کو بحران کا شکار رکھا جائے اور براہ راست فوجی مداخلت بھی نہ ہو۔ اس میں آئی ایس آئی اور آئی ایس پی آر کو کیانی ڈاکٹرائین (نظریے) کے تحت استعمال کیا گیا۔ احتجاجی تحریک کے لئے عمران خان اور چوہدریوں کو اس عمل میں استعمال کیا گیا"۔ آگے چل کر نجم سیٹھی نے یہ اشارہ بھی دیا کہ مستقبل قریب میں اگر جنرل راحیل غیر سیاسی جرنیلوں کو کور کمانڈر منتخب کرتے ہیں تو اس عمل کو نواز شریف بطور وزیر اعظم لیڈ کرینگے۔ جرنیلوں کے انتخاب سے پہلے کا مرحلہ ہیجانی تھا، اور اسی لئے شاید نواز شریف کو منظر سے ہٹانا ضروری خیال کیا گیا۔

اب ایک اور پہلو کا جائزہ لیتے ہیں۔ پاکستان کے تاریخ میں پہلے ایسا کبھی نہ ہوا۔ ایک تحریک کو اٹھانے کی کوشش کی گئی اور پھر نہ صرف اس تحریک میں شامل ایک جماعت میں پھوٹ پڑ گئی بلکہ حکومت کی حلیف جماعتوں کی جانب سے وزیر داخلہ پر یہ الزام لگا کہ اس کا تحریک کے راہنماؤں اور ان کی پشت پر کارفرما قوتوں سے کسی قسم کا رابطہ تھا۔ تحریک میں پھوٹ صرف اس لئے نہ پڑی کہ جاوید ہاشمی نے بھانڈا پھوڑ دیا، کہ ان کے راہنما عمران خان اور ان کے کچھ ساتھی یہ گفتگو کرتے پائے گئے کہ "وہ" احتجاجی تحریک کے معاون ہیں۔ بلکہ تحریک انصاف کے اسمبلیوں کے اراکین سے استعفیٰ طلب کرنے پر بھی پھوٹ پڑی۔ کیونکہ ایم این اے اور ایم پی اے استعفیٰ دینے پر راضی نہ تھے۔ آغاز میں تحریک کا زور شور ایسا تھا کہ پاکستان کے موجودہ نظام کے خلاف عوامی ابھار جنم لیتا محسوس ہونے لگا۔ میڈیا نے پہلے تو اس احساس کو شدت دینے میں سرگرمی دکھائی۔ اور جب یہ باتیں سامنے آئیں کہ اس تحریک کی پشت پر "وہ" ہیں، تو الٹا ایسے بیانات ٹیلیویژن پر تکرار کے ساتھ آنے لگے جن میں عمران خان اور ڈاکٹر قادری کے تعلقات اسٹیبلیشمنٹ کے ساتھ ملنے کا تاثر ابھرا۔

تحریک جزوی طور پر تو کامیاب ہوگئی، لیکن اس پر سازش کا بٹہ لگ گیا۔ میڈیا، سول سوسائٹی، وکلاء کی تنظیموں، پارلیمنٹ میں بیٹھے راہنماؤں کی اکثریت نے اس "سازش" کی مذمت میں وہ غلغلہ بلند کیا، کہ عوام کی جانب سے اس کی وسیع مذمت کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ کیا یہ تحریک سازش کا بٹہ لگنے

کے باعث ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئی؟ یہ سوال اہم ہے۔ کیونکہ اسی پر اس امر کا انحصار ہے، کہ اسٹیبلیشمنٹ آگے چل کر کیا داؤ پیچ آزمانے والی ہے، جن کے ذریعے اس تحریک کو دوبارہ کھڑا کر دیا جائے۔ اس سارے قصے میں حکومت پر تین قسم کا دباؤ پڑا۔ اول اس تحریک کے ذریعے، دوم اس بنیاد پر کہ اس کی کارکردگی اور رویہ اچھا نہ تھا، اور سوم اس کے اندر دو قسم کی متضاد روش ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے وزیر "سازش" میں شریک بتائے جاتے ہیں۔ دوئم یہ کہ اس میں وہ سیاسی پختگی نہیں، کہ اپنا دفاع کر سکے۔

پارلیمنٹ میں سینیٹر اعتزاز احسن کی ۵ ستمبر کی تقریر کو اس تناظر میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا جو پروفائل پیش کیا اس کی بنیاد پر وہ مستقبل میں سب سے تگڑے اور قابل قبول وزیر اعظم کے امیدوار ہیں۔ انہوں نے کہا "میں چاہوں تو پوری پارلیمنٹ کو گرا دوں" یہ طاقت اور پروفائل کیانی ڈاکٹرائین کے تحت کام کرنے والوں کو درکار تھی، لیکن ڈاکٹر قادری اور عمران خان سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اعتزاز جیسا شعلہ بیاں اور موقع شناس اس ڈاکٹرائین کو دستیاب نہ ہو سکا۔ اس استدلال کو میڈیا اور عوام کی اکثریت میں پذیرائی ملی کہ ڈاکٹر قادری اور عمران خان کے مطالبات اور طریقہ کار کو مان لیا جائے، تو کل کوئی اور یہی مطالبہ اسی طریقے سے لے کر انہی قوتوں کے اشارے پر دارالخلافے پر چڑھ دوڑے گا۔ سپریم کورٹ بھی اس استدلال کو قبول کرتی محسوس ہوئی، حالانکہ نواز شریف حکومت کے قیام، اس کی کارگزاری اور طریقہِ حکومت سے ہر جانب اختلاف موجود ہے۔

نواز حکومت فی الحال سیاسی جنگ جیت چکی، اور انتظامی جنگ ہار گئی۔ دارالخلافے پر حملے کو نہ روکنا انتظامی ناکامی تھی۔ لیکن سیاسی جنگ جیتنا ہی شاید اس حکومت کا مطمح نظر تھا۔ کیا یہ سیاسی جیت زیادہ عرصہ قائم رہ سکے گی؟ یہ سوال اہم ہے۔

اے این پی کے رہنما، شاہی سید نے ۷ ستمبر ۲۰۱۴ کو جیو ٹی وی کے ایک پروگرام میں کہا "فوج اپنی مرضی سے آئے گی۔ اس کے آگے دیوار نہیں کھڑی کی جاسکتی۔ ایسی کوئی قوت یا دلیل نہیں جو اُسے روک سکے"۔

جو سیاسی جیت نواز حکومت اور پارلیمنٹ کی ہوئی، وہ عارضی ہو سکتی ہے۔ لیکن ماضی کے مقابلے میں اب صرف ۲ بہانے اس نظام کی بساط لپیٹنے کے لئے دستیاب ہیں: دھاندلی اور کرپشن۔ اب یہ بہانہ نہیں چلے گا کہ عوام حکومت کے ساتھ نہیں، اور پارلیمنٹ حکومت کی پشت پر نہیں، ماضی میں یہی ہوتا تھا۔ لوگ یہ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ قادری اور عمران خان کی دارالخلافے پر چڑھائی کے نتیجے میں حکومت نہ گرنے کے باوجود نواز شریف اور پارلیمنٹ، میڈیا، سپریم کورٹ اور عوام کی اکثریت کی حمایت مزید حملے یا ایک اور خطرناک حملہ روکنے کے لئے کافی نہ ہوں گے۔ اور یہ اندیشہ اس کے باوجود ہے، کہ صدر تحریک انصاف، جاوید ہاشمی نے عمران خان اور ان کے ساتھیوں کا "تھرڈ ایمپائر" اور "وہ قوتیں" پر انحصار کو فاش کر ڈالا۔ اور اس کے باوجود کہ قادری اور عمران خان کے ڈنڈا بردار پارلیمنٹ اور پاکستان ٹیلی ویژن کی عمارات پر گھناؤنے حملوں کے باعث دونوں رہنماؤں کو عوام کی نظر سے حتمی طور پر گرا چکے۔

ایک ریٹائرڈ جنرل نے جیو ٹی وی پر ۷ ستمبر کو کہا "سول ملٹری تعلقات اس وقت بہتر رہ سکتے ہیں۔ جب دونوں مضبوط ہوں۔ ایک بھی کمزور تو رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے"۔

نواز حکومت، پارلیمنٹ اور عوامی اکثریتی حمایت میں وہ کونسی کمزوری ہے کہ یہ رشتہ کمزور پڑ رہا ہے؟ یہ سوال بھی جواب طلب ہے۔

اسی پروگرام میں جیو ٹی وی کے میزبان سلیم صافی نے جنرل کو کہا، "آپ کے ایک ائر مارشل کو ہمارے لوگوں نے ہمارے دفتر سے نکلتے ہوئے دھرنے کے لیڈروں سے یہ کہتے سنا، کہ آپ پولیس کو سنبھال لیں، فوج کی جانب سے کوئی ردعمل نا ہو اس کی ضمانت میں دیتا ہوں۔

دھرنے اور لانگ مارچ کے بارے میں دو سوالات اہم ہیں۔ ایک یہ، کہ کیا زمان پارک اور ماڈل ٹاؤن لاہور سے چلنے والے لانگ مارچ کو روکا نہیں جا سکتا تھا، اور جب یہ دھرنے اسلام آباد پہنچ گئے، تو انہیں ڈی چوک یا شاہراہ دستور پر جانے سے نہیں روکا جا سکتا تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے، کہ جب موسلا دھار بارشیں ہوئیں اور دھرنے کے لوگوں کی اپنی حفاظت کے لئے بھی انہیں چلتا کرنا ضروری تھا، حکومت نے اقدام کیوں نہ کیا۔ ظاہر ہے، حساس اور

قومی عمارات پر حملوں سے تو خود دھرنے والوں کی "وابستگی اور عزائم" بے نقاب ہوگئے تھے اور ان سے حکومت کو سیاسی فائدہ بھی ہوا۔ لیکن حکومت چوکس نظر نہ آئی۔

ان سوالات کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ اس سوال کی، کہ جب حکومت کو معلوم تھا کہ لانگ مارچ اور دھرنا کرنے والی سیاسی قوتوں کو پشت پناہی حاصل ہے، تو حکومت نے اس وقت انہیں کیوں بے نقاب نہ کیا جب وہ اسلام آباد پر قبضہ جمانے لاہور سے چل رہی تھیں۔ ان سوالوں کی اہمیت اتنی بڑی ہے جتنی اس سوال کی، کہ ماضی میں تخریبی قوتوں کو کھڑا کرنے کے بعد اب اُن کے خلاف فوجی کاروائی کیوں کی گئی؟

حامد میر کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے تحریک انصاف کے رہنما شاہ محمود قریشی کے بھائی نے بتایا کہ شاہ محمود نے تحریک انصاف میں شمولیت کے وقت انہیں دعوت دی کہ ان کی جماعت میں آ جائیں، کیونکہ اس کا مستقبل روشن ہے۔ اس کی ضمانت انہیں (شاہ محمود کو) جرنیلوں نے دی ہے۔ ان کی (شاہ محمود کی) ان سے ملاقات خفیہ طریقے سے کرائی گئی۔

اس دوران ڈاکٹر قادری نے اپنے ریڈ زون کے خطبوں میں یہ دلیل مضبوطی سے تھامے رکھی کہ نظام کی تبدیلی پارلیمنٹ کے ذریعے نہیں ہوسکتی۔ جبکہ عمران خان کی بنیادی دلیل یہ رہی کہ یہ پارلیمنٹ ہی جعلی ہے۔ ڈاکٹر قادری اس دوران یہ دھمکیاں دیتے رہے۔

۱۔ عوام کا لاوا پھٹنے والا ہے۔
۲۔ عوام جعلی اسمبلی اور اس حکومت پر چڑھ دوڑیں گے۔
۳۔ اگر ہمارے مطالبات نہ مانے گئے تو کفن پوش حملہ کرینگے۔
۴۔ ریڈ زون کو انقلابی قبرستان بنا دیا جائے گا۔

اسلام آباد پر لانگ مارچ کی چڑھائی اور دھرنے کے باعث پھیلنے والے خدشات تین قسم کے تھے۔ اول، کہیں آپریشن ضربِ عضب ناکام نہ ہو جائے۔ دوئم یہ کہ کہیں وفاق کو خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔ اور سوئم یہ کہ کہیں پاکستان کے بارے میں ناکام ریاست کا تاثر اتنا گہرا نہ ہو جائے، کہ پھر یہ نہ پارلیمنٹ کی قوتوں سے سنبھل سکے اور نہ ہی فوج سے۔

پارلیمنٹ میں موجود قوتیں صرف ایک خدشے کا اظہار کر رہی تھی۔ جمہوریت کی بساط لپیٹنے کی سازش کامیاب نہ ہو جائے۔ لیکن مذکورہ بالا تین خدشات کو مختلف قسم کی قوتوں سے جوڑا گیا۔ اور پھر یہ خدشہ بھی ظاہر کیا جانے لگا، کہ کہیں پاکستان بھی صومالیہ، لیبیا، عراق اور شام نہ بن جائے۔ اس خدشے کو زیادہ تر بیرونی قوتوں سے جوڑا گیا۔ جیو ٹی وی پر ۷ ستمبر ۲۰۱۴ کو ایک پروگرام میں شریک ایک مبصر نے یہاں تک کہہ دیا کہ برطانوی پولیس کے نوجوان اس دھرنے کو کامیاب کرنے کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔

یہ تمام خدشات اس باعث ابھرے، کہ کم تعداد میں مارچ اور دھرنے کے شرکاء کے باوجود ڈاکٹر قادری اور عمران خان کو بہت بڑے بڑے دعوے کرتے اور دھمکیاں دیتے سنا گیا۔ دوسرا یہ کہ ان کا واضح طور پر ناکام ہونے کے باوجود یہ اصرار جاری رہا کہ "نواز حکومت کو گرا کر رہیں گے"۔ حالانکہ مارشل لاء لگائے بغیر نواز حکومت کے گرنے سے ساری اسمبلیاں بھی نہیں ٹوٹ سکتی تھیں۔ تیسرا یہ کہ میڈیا پر ان تانوں بانوں کا تواتر سے ذکر شروع ہو گیا، جو دھرنے اور مارچ کو بیرونی قوتوں سے، اور فوج سے جوڑتے تھے۔ اور ان خدشات کے باوجود دھرنوں کا ختم نہ ہونا اچنبھے کا باعث تھا۔ اس ضدی حرکت کے باعث آخر میں یہ خدشہ ابھرنے لگا کہ "یہ لوگ مارشل لاء لگوا کر رہیں گے"۔ جو لوگ اخبارات اور ٹیلیویژن کے ذریعے ان خدشات کو باطل قرار دینے کی کوشش کرتے رہے، انھوں نے سب سے مضبوط دلیل مارشل لاء کے خطرے کے خلاف دی، اور وہ یہ تھی، کہ "فوج ایسا نہیں کرے گی"۔

سینیٹر رضا ربانی نے ۵ ستمبر کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں کہا کہ "پر اکسی کے ذریعے حکومت ہٹانے کی کوشش ہو رہی ہے"۔ لیکن انکی نہ سنی گئی۔ اکثریتی تجزیہ یہی تھا کہ فوج اب کے یہ حرکت نہیں کرے گی۔ اور دلیل یہ تھی کہ فوج مشکلات میں گھری ہوئی ہے، اور حالات بھی مارشل لاء کے لئے سازگار نہیں۔ اگر یہ دلیل حقیقت پسندانہ تھی، تو سوال یہ اٹھتا تھا، کہ آخر بغیر "اشارے" کے دھرنے والے کیوں اتنی انرجی ضائع کر رہے ہیں؟ کیا یہ لوگ پاگل ہیں؟ یا پھر واقعی سچے داعی ہیں حقیقی جمہوریت اور انقلاب کے؟

خدشات کو زیادہ تقویت اس انتشار کے باعث ملی، جو دھاندلی اور ماڈل ٹاؤن میں ہلاکتوں کے بارے میں جاری رہا، اور جس نے پارلیمنٹ کی

اکثریت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ (اکثریتی) یہ کہتا تھا کہ دھاندلی اور ہلاکتیں ایسی شکایتیں ضرور ہیں جن پر اتنا بڑا احتجاج کیا جائے، لیکن طریق کار پر سوالیہ نشان ہے، کیونکہ ایک طرف وزیراعظم کا استعفیٰ غیر آئینی طریقے سے طلب کیا جا رہا ہے، جبکہ دوسری جانب انقلاب لانے والے لوگوں کا اپنا سیاسی کردار مشکوک رہا ہے۔ دوسرا حصہ یہ کہنے لگا کہ نہ تو دھاندلی کا الزام صحیح ہے، نہ ہی انقلابی جتھے کے پاس ماڈل ٹاؤن میں ہلاکتوں کی بنیاد پر دارالخلافے پر چڑھائی کا کوئی جواز تھا۔

انتشار پارلیمنٹ کی اکثریت کو بھی رہا، اور دھاندلی مخالف اور انقلابی قوتوں کے بارے میں بھی رہا۔ اس سے بھی یہ خدشہ ابھرنے لگا کہ دونوں جانب ایسی قوتیں ہیں، جو فیئر پلے والے کردار کی حامل نہیں، پھر بھی جو سیاسی اُبال پاکستان میں لایا جا رہا ہے، اس کے پیچھے "سازش" ہی ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ کتنی بڑی سازش تھی؟ اس سوال کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا، جب تک سازش کے جواز کے بارے میں بات نہ کر لی جائے۔

کیا پاکستان کے حالات ایسے ہیں کہ کوئی سازش کی جائے؟ ان حالات میں پاکستان کی بڑھتی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے، خواہ وہ بیرونی سازش ہو یا مارشل لاء لگانے، یا حکومت کو کمزور بنانے کی، جواز صرف دو بنیادوں پر حاصل ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ دھاندلی اور ہلاکتیں ایک حکومت کے الٹانے کا جائز جواز ہوسکتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ پاکستان اب حکمرانی کے قابل رہا ہی نہیں، اور ملک ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، جو دھاندلی کا الزام تسلیم کرنے کے باوجود "آگے چلتے رہو" کی تلقین کرتے ہیں، تاکہ ان کے بنیادی طبقاتی سیاسی مفادات پر زد نہ پڑے۔ ان دو بنیادوں پر سازش تبھی کامیاب ہو سکتی ہے، جب عوام میں یہ احساس بڑھ جائے کہ ناقابل حکمرانی ہونے اور حکومتوں کی کارگزاری کی امید ختم ہونے کے باعث پاکستان اپنی اساسِ اقتدار کھو بیٹھا ہے۔ عوام میں یہ احساس بھی جاگزیں ہو چکا ہے کہ اس نظام کے خلاف سیاسی جدوجہد کا کوئی نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا۔ اسی عوامی احساس کی بنیاد پر فوج اور پارلیمنٹ کو ضعف پہنچانے والوں کی پاکستان مخالف امید بندھتی ہے۔ دھاندلی اور انقلابی قوتوں کے تابڑ توڑ حملوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان قوتوں کی جانب سے پاکستان کے اساسِ اقتدار کو مزید کتنا دھچکا لگانے کا خدشہ ہے؟ یہ سوال مستقبل میں اہم رہے گا۔

ظاہر ہے، سازش کرنے والے اس مزید دھچکے کا انتظار کریں گے۔ اور ایسا انتظار کر کے ملک کے اندر کی منہ زور قوتوں کو استعمال کرنے میں لگے رہیں گے۔ جب حکومت سیاسی لحاظ سے مضبوط، لیکن انتظامی لحاظ سے مارچ اور دھرنے کے خلاف کمزور نظر آئی، تو "سازش" کے خدشے کو مزید تقویت ملی۔ اگر حکومت مسلسل انتظامی طور پر کمزور اور "سازش" کے "مہروں" کو تقویت دیتی نظر آئے، تو منہ زور قوتیں، عوام الناس کی سیاسی بیگانگی، ریاستی اداروں کی کمزوری کا ماحول "دھچکے" کے لئے سازگار بنتا جائے گا۔ اسی خدشے کی بنیاد پر میرے ذرائع مسلسل یہ کہہ رہے ہیں، کہ عنقریب، دو یا چار ماہ میں، نواز حکومت پر ایک اور، شاید پہلے سے زیادہ کارگر حملہ ہوگا۔

سماء ٹی وی کے ایک پروگرام میں شیخ رشید سے پوچھا گیا "ان دونوں (قادری اور عمران خان) کو آپ نے ملایا ہے، یا "تھرڈ ایمپائر" نے؟ شیخ رشید نے کوئی معقول جواب نہ دیا، لیکن یہ کہا کہ "دھرنا خالی نہ جائے گا"۔ شیخ رشید صحیح ثابت ہوں یا غلط۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لانگ مارچ اور دھرنے کے دوران تحریکی لیڈروں اور پارلیمنٹ میں بیٹھی قوتوں کی جانب سے انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا گیا۔ تحریکی لیڈروں نے غلط وقت پر غلط طریقے سے ایک صحیح مقصد کو عوام میں مقبول کرنے کی کوشش کی۔ پارلیمنٹ اور حکومت نے یہ حقیقت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اس تحریک میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کی زندگی کا مطالبہ انصاف تھا۔ اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ وہ خود آئے تھے یا انہیں ورغلا کر لایا گیا۔ اس حقیقت کو اعتزاز احسن اور رضا ربانی نے بھی تسلیم کیا جب اعتزاز نے یہ کہا کہ عمران خان بہادر آدمی ہے لیکن ہارے ہوئے لشکر میں ہے۔ اور رضا ربانی نے یہ کہا کہ حکمران طبقے کے خلاف بغاوت کے آثار ہمارے سامنے ہیں۔

مصنف نے اپنے ۳۵ سالہ صحافیانہ کیریئر کے دوران کاونٹر ٹیررازم ٹیکس رپورٹنگ اور دیگر اقتصادی وسیاسی موضوعات پر کام کیا۔
اس میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

اہم مسائل اور حکومت کی عدم توجہ

الہام کاکڑ

گزشتہ ایک دہائی سے پاکستان سنگین حفاظتی خدشات سے دوچار ہے اور عسکریت پسند گروہوں کے خلاف مسلسل جنگ میں مصروف ہے۔ ۱۵ جون ۲۰۱۴ء کو شمالی وزیرستان کے عسکریت پسند گروہوں کے خلاف "ضربِ عضب" کے نام سے آپریشن شروع کیا گیا۔ اپنے گھروں کو اور اپنے علاقوں کو چھوڑنا یقیناً ایک نہایت تکلیف دہ اور ناخوشگوار لمحہ ہوتا ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ شمالی وزیرستان کے بے گھر افراد اس تکلیف دہ مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ فوجی آپریشن کے نتیجے میں شمالی وزیرستان سے بہت سے لوگ بے گھر ہوئے، ان افراد کو بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، لکی مروت، ٹانک اور کرک کے اضلاع میں کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا۔

قبائلیوں کے اِن کیمپوں کو اگر دور سے دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ایک نیا شہر آباد ہو گیا ہے۔ تاہم تمام تر مسائل کے باوجود مقامی انتظامیہ، قومی اور صوبائی ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی اور دیگر ادارے اس صورتحال سے نمٹنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے لیے ۱۰ جگہوں پر اندراج کے لئے سروس پوائنٹس اور ویٹنگ ایریاز مقرر کئے گئے ہیں۔ ۲۰ اندراج کے میز اور ۴ نادرا سروس پوائنٹ اندراج کے عمل کو تیز رفتار بنانے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ جبکہ ۲۰ پانی کی ٹینکیاں، ۶ لیٹرین، ۴ موبائل ہیلتھ یونٹ، اور ۵ ایمبولینسیز قبائلیوں کو خدمات فراہم کرنے کے لیے دستیاب کی گئیں ہیں۔ مختلف خاندانوں کی جانب سے ان کو کھانے پینے کی اشیاء، پانی اور کھجوریں بھی فراہم کی گئیں ہیں۔

ماسٹر شیر آدم وزیر جو کہ شمالی وزیرستان کے بے گھر افراد کے صدر ہیں انہوں نے قبائلیوں کی موجودگی میں ڈیرہ اسماعیل خان پریس کلب میں کی جانے والی پریس کانفرنس میں ان کے مسائل کی نشاندہی کی۔ انہوں نے بتایا کہ ایک لاکھ سے زائد افراد محض اس لیے امداد سے محروم ہیں کہ ان کے شناختی کارڈوں پر مستقل اور موجودہ پتوں میں تضاد موجود ہے، اس کے علاوہ ۴۵ فیصد افراد جو کہ میر علی اور میران شاہ کے علاقوں کے علاوہ دیگر علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کے شناختی کارڈ موجود نہیں ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اس بات کی نشاندہی بھی کی کہ ان افراد کے خلاف قانونی کاروائی کرنی چاہیئے جو جھوٹا دعوی کر رہے ہیں کہ وہ شمالی وزیرستان سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی وجہ سے بہت سے اختلافات پیدا ہو رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا مطالبہ پیش کیا ہے کہ جو لوگ کرائے کے گھروں

میں رہ رہے ہیں ان کے بل معاف کیے جائیں۔ یہ مطالبات قابل غور ہیں کہ قبائلیوں کو چھوٹ دی جانی چاہیئے؟ کیا جو لوگ گھروں کے کرائے ادا کر سکتے ہیں وہ بجلی کے بل ادا نہیں کر سکتے؟ اس بات کی نشاندہی بھی کی گئی کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں قائم کردہ کیمپوں میں صحت کی سہولیات میسر ہیں، جبکہ بنوں میں موجود بے گھر قبائلی موبائل فون کے ذریعے نقد امداد حاصل کر رہے ہیں جبکہ ڈیرہ اسماعیل خان میں موجود افراد کے لیے ایسی کوئی سہولت موجود نہیں۔

صوبائی ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کی جانب سے دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق ۸۷۶،۹۹۹ افراد پر مشتمل ۷۵،۲۴۱ خاندانوں کا اندراج ہو چکا ہے۔ ان افراد کے اندراج کے حوالے سے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ خاندانوں نے فوجی آپریشن سے قبل ہی اپنے گھر چھوڑ دیے تھے اور اب تک ان کا اندراج بے گھر افراد کی فہرست میں نہیں ہوا۔ جو لوگ دیر سے کیمپوں میں پہنچے ان کو اندراج کروانے کے لیے انتظار کرنا پڑا کیونکہ اندراج کرانے والے لسٹ ختم ہو گئے تھے۔ اندراج کا عمل نادرا کے دفتر میں سیاسی انتظامیہ اور قبائلی علاقے کے منتظمین کی موجودگی سے آسان بنایا جا سکتا ہے۔

حکومت نے قبائلیوں کے لیے سروس پوائنٹ کا انعقاد کیا ہے۔ اندراج شدہ افراد کو نادرا اور زونگ کونٹریکٹر کے ذریعے امداد مہیا کی جا رہی ہے۔ امدادی ٹیموں کے ساتھ زیادہ تر مرد اہلکار کام کر رہے ہیں۔ یہ ایک اہم وجہ ہے کہ قبائلی علاقوں کے سربراہان اپنے گھر کی خواتین کو امدادی سامان لینے نہیں جانے دیتے۔ اس کے علاوہ یہ مطالبہ بھی آیا ہے کہ اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے کہ خواتین زیادہ دیر قطاروں میں نا کھڑی رہیں، امداد فراہم کرنے والے اہلکاروں کی تعداد میں اضافے کی ضرورت ہے۔ ثقافتی تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اندراج اور سروس پوائنٹ پر خواتین عملے کی تعداد میں اضافے کی ضرورت پر زور دیا جانا چاہیئے۔

تاہم بے گھر افراد غیر موافق رہائشی سہولیات کی وجہ سے صحت کے سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ عالمی ادارہ صحت نے ان کے صحت کے مسائل سے نمٹنے کے لیے ۲۵۰،۰۰۰ ڈالر مالیت کی ادویات کا عطیہ دیا ہے۔ موجودہ صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خیبر پختونخواہ کے محکمہ صحت نے ۴۶۹،۱۱۰ افراد کو پولیو ویکسینیشن فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے اس کے علاوہ بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، کرک، ٹانک اور لکی مروت میں حفاظتی ٹیکوں کی سرگرمیاں بھی منعقد کر رہا ہے۔

گھر گھر جا کر حفاظتی ٹیکے لگانے کی مہم کا انعقاد کیا گیا ہے تا کہ وہ افراد جو علاقے میں کرائے پر یا کسی کے گھر پر رہ رہے ہیں ان تک بھی رسائی ممکن ہو سکے۔ یہ افراد صاف پینے کے پانی کی عدم دستیابی سے بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ کیمپوں میں موجود بچے اور عورتیں سنگین صحت کے مسائل سے دوچار ہیں۔ بچوں میں جلد کی بیماریاں جبکہ خواتین میں تولیدی مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ کیمپوں میں صحت کی سہولیات کے ساتھ ساتھ لیڈی ڈاکٹر اور لیبر روم کی سہولیات بھی موجود ہیں، اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ ڈیرہ

۲

اسماعیل خان کی نسبت بنوں میں موجود میڈیکل کی سہولیات زیادہ بہتر ہیں اور یہ کہ خواتین اور بچے شدید ذہنی تناؤ کا شکار ہیں۔

شمالی وزیرستان میں جاری آپریشن سے نا صرف قبائلی بے گھر ہو گئے ہیں بلکہ ان کا ذریعہ معاش، صحت اور تعلیم بھی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ بے گھر افراد میں تقریباً ۴۳ فیصد بچے ہیں جو کہ کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان بچوں کی تعلیم متاثر ہوئی ہے اور وہ بھیک مانگ کر گزارا کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ ان کے گھروں میں دی جانے والی امداد ان کے کنبے کے لیے ناکافی ہے۔ ان بچوں کے کھیل کود کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ بے گھر افراد کو فراہم کی جانے والی امداد اس بات کو مدِ نظر رکھ کر فراہم کی جانی چاہیئے کہ ان کیمپوں میں مکین لوگوں میں بچوں کی تعداد زیادہ ہے تاکہ ان بچوں کی ضروریات کا خیال بھی رکھا جا سکے۔ کیمپوں میں تعینات عملے کو ان کیمپوں کی نشاندہی کرنی چاہیئے جن میں بچے ہیں اس کے علاوہ اُن بچوں کے لیے بھی مناسب اقدامات کرنے کی ضرورت ہے جو لاوارث ہیں۔

بے گھر افراد کی ایک بڑی تعداد جو کہ اسکولوں میں زندگی بسر کر رہی تھی اب اسکول کی چھٹیاں ختم ہو جانے پر ان کو نوٹس جاری کر دیا گیا ہے کہ وہ اسکول سے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ حکومت کی جانب سے ان کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتظام نہیں کیا گیا اور ان لوگوں کے لیے خود سے کسی جگہ منتقل ہونا نہایت مشکل ہے۔ البتہ ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک سٹیڈیم میں شمالی وزیرستان کے بے گھر افراد کے لیے جگہ بنائی جا رہی ہے۔ ان افراد کو رہائش، حفاظتی اور مالی امداد کے مسائل درپیش ہیں جس کی وجہ سے قبائلی عمائدین کا حکومت سے مطالبہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے اپنے علاقے میں لوٹنے کے کسی ایک مقررہ وقت کا اعلان کریں۔

۱۹۹۸ء کے بعد مردم شماری نا ہونے کی وجہ سے ان بے گھر افراد کی تعداد کا اندازہ لگانا نہایت مشکل ہے یہ بھی ایک اہم وجہ ہے کہ ان لوگوں کی ضروریات کو مناسب طور پر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات سامنے آئی ہے کہ شمالی وزیرستان کے ہر بے گھر خاندان کے افراد کی تعداد تقریباً ۱۳ ہے۔ امدادی اشیاء ان خاندانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہیں کیونکہ ان کو ایک عام خاندان کی تعداد کے حساب سے تیار کیا گیا تھا۔

ملک میں موجودہ سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے قبائلی برادری کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ شمالی وزیرستان کے افراد نے اپنے مسائل کو ڈیرہ اسماعیل خان پریس کلب میں اجاگر کیا تھا لیکن بدقسمتی سے کابینہ کے اراکین اور صوبے کے وزیرِ اعلیٰ صوبے سے باہر جاری احتجاجی دھرنوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے حکومت کو یاددھانی کروائی ہے کہ وہ سیاسی ایجنڈے کے بجائے بے گھر افراد کی بنیادی سہولیات کی فراہمی پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔

شمالی وزیرستان کے لوگ جن کے سروں پر پہلے سے ہی خطرے کی تلوار لٹک رہی ہے کیونکہ انہوں نے امن کی بحالی اور عسکریت پسندوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے گھر بار چھوڑے ہیں۔ شمالی وزیرستان میں جاری فوجی کاروائیوں کی وجہ سے بہت سے مسائل اُمڈ آئے ہیں جن کی ایک وجہ فوج، حکومت اور مقامی افراد کے درمیان تعاون کی کمی ہے۔

حکومت ان بے گھر افراد کی رجسٹریشن اور ان کو رہائش فراہم کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ ان افراد کو یہ تک معلوم نہیں کہ وہ اپنے گھر دوبارہ واپس کب جائیں گے۔ فوج اور حکومت ان کو ایک مقررہ وقت تک بتانے میں ناکام ہے۔ شمالی وزیرستان کے بے گھر افراد کی بحالی کا انحصار عسکریت پسند گروہوں کے خلاف کیے گئے فوجی آپریشن کی کامیابی پر بھی ہے۔ ہمیں مشکل کی اِس گھڑی میں اپنے قبائلی بہن بھائیوں کا ساتھ دینا ہوگا تاکہ اُس قربانی کا اعتراف کیا جا سکے جو انہوں نے پورے پاکستان کے لئے دی ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں کمیونیکیشن آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

ضربِ عضب:
ایک نیم دلانہ اور مشکوک کاروائی

اکرام ہوتی

کیا پاکستانی ریاست واقعی کسی بڑے خطرے سے دوچار ہے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں بہت سے تجزیہ کار لگے رہتے ہیں۔ زیادہ تر اس خطرے کی وجوہات تلاش کرنے اور اس کی مختلف زاویوں سے نشانیوں کو اجاگر کرنے میں الجھے رہتے ہیں۔ ایسے بھی بہت ہیں جو کبھی ایک تجویز سامنے لاتے ہیں کبھی دوسری، کہ اس خطرے کو ٹالا جا سکے۔ ان کی کاوشوں سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کو خطرہ تو بے شک لاحق ہے، لیکن شاید اسے ٹالنے کے لئے کوئی مجرب نسخہ موجود نہیں۔ ظاہر ہے، ایسے تجزیوں سے مایوسی میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن جن حالات سے پاکستان ۱۹۸۰ء کی دہائی سے گزرتا آیا ہے، وہ کسی کے بس میں نہیں رہے۔ ہر ادارہ بگاڑ میں اضافے کا باعث بنتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ بگاڑ میں حصہ ڈالنے والوں کا اصلاح کی قوتوں پر غالب ہونا محسوس ہونے لگا، اور پھر یہ عمومی احساس گہرا ہوتا گیا، کہ اب حالات کسی کے قابو میں نہیں رہے۔

ایسی صورتحال میں مایوسی اور بے تکے نسخے ہی فروغ پاتے ہیں۔ لیکن کیا واقعی کوئی ایسا طریقہ کار موجود نہیں جو پاکستان میں بگاڑ اور تخریب پیدا کرنے والی قوتوں کو لگام دے کر ملک اور ریاست کو اصلاح کی شاہراہ پر ڈال سکے؟

اس سوال کا جواب تبھی مل سکتا ہے، جب بگاڑ کی قوتوں کی حقیقت پسندانہ تشخیص ہو جائے۔ اور ایسی تشخیص تعصّبانہ اور نیم حکیمانہ رویوں سے چھٹکارا پا کر ہی ممکن ہے۔ تعصب اور اٹکل پچو قسم کی تشخیص ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ مان لیا جائے کہ سیاستدانوں سے اصلاحی کوششوں کی توقع نہیں کی جا سکتی، اور اس ملک کو فوج یا پھر کسی قہر مند انقلابی کی ضرورت ہے، تو پھر اس سوال کا جواب دینا ہوگا، کہ اداروں کے بگاڑ اور گینگ کلچر کے باعث جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، انہیں دور کرنے کے لئے انقلابی شخصیت اور گروہ کس کونے سے ابھرے گا؟ کیا فوج میں سے؟ اس ادارے کی تربیت سیاسی پیچیدگیوں کو سلجھانے اور بحرانوں سے نمٹنے کی نہیں۔ کیا سول سوسائٹی میں سے؟ ملک کی سیاسی اور فوجی قوتیں اس طبقے میں سے کسی لیڈر کو اس حد تک ابھرنے کی اجازت ہی نہ دیں گی، کہ وہ ایک انقلابی گروہ بنا سکے۔ چونکہ ہر ادارے پر سوالیہ نشان کھڑا ہو چکا ہے، لہذا یہ امید بچگانہ ہوگی، کہ کسی سیاستدان کو انقلابی اقدامات کے لئے عوامی تائید حاصل ہو پائے گی۔ کوئی ادارہ انقلابی اصلاحات کے لئے تیار نہیں۔ کسی ادارے کو انقلابی اصلاح کے لئے تیار کرنے کے واسطے جس بیکراں عوامی تائید کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شاید کسی سیاسی یا فوجی لیڈر کو نصیب نہ ہو۔ یہی ناامیدی، مایوسی اور انتشار کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ اس انتشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف اداروں میں گینگ کلچر کو فروغ حاصل ہوتا رہا ہے۔ اور تخریب اس انتشار کا نتیجہ اور اس کے فروغ میں معاون ہے۔ گینگ کلچر انتشار، تخریب اور مایوسی ایک دوسرے کو تقویت بخشتے ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں، جہاں ریاست کے پنپنے میں ناکامی نے گینگ کلچر، تخریب اور انتشار کو فروغ دیا، اصلاح کے لئے اقدامات انقلابی عمل تو ہوگا، لیکن اسے شروع اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک یہ معلوم نہ کر لیا جائے کہ ریاست کے پنپنے میں کونسی رکاوٹیں حائل ہیں۔ ایسے میں یہ سوال اہم ہے کہ فوج تخریبی قوتوں کو کچلنے کے لئے کیا طریقہ کار آزما رہی ہے؟

کیا ریاست کے پنپ جانے سے گینگ کلچر، انتشار اور تخریب، ادارتی زوال اور مایوسی کو لگام دینا ممکن ہوگا؟ جی ہاں۔ ریاست ہر ملک میں پہلا کام ہی

یہ کرتی ہے کہ ادارتی نظام کو قائم کرتی ہے۔ اور ادارتی نظام کا شکنجہ گینگ کلچر کو پنپنے نہیں دیتا۔ گینگ کلچر نہ ہو تو تخریب اور انتشار بھی جنم نہیں لے سکتے۔ پاکستان میں ریاست کی تشکیل کا عمل کسی بھی ادارتی نظام کو جاری نہ کر سکا۔ اقتدار کے حصول کی کشمکش، اور نو آبادیاتی دور کے بوسیدہ ریاستی ڈھانچے کا زوال پاکستان میں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ بالآخر فوج نے ریاستی قوت کے طور پر ایک دھونس حاصل کر لی، لیکن ادارتی نظام، قانون کی عملداری اور گینگ کلچر کی حوصلہ شکنی کے لئے درکار جمہوری ڈھانچہ کھڑا نہ کیا جا سکا۔ عسکری اقتدار کے نہ تو مزاج میں یہ کام تھا، نہ ہی تربیت میں۔ ریاست کے نام پر کھڑی کی گئی عسکری سیاسی قوت کا استعمال اس ڈھنگ سے ہوا، کہ ہر ادارے کی اٹھان یا تو فوجی انداز سے ہونے لگی، یا پھر گینگ کلچر کے تحت۔

نتیجہ یہ نکلا کہ فوج اور اس کا ریاستی اقتدار تو قائم ہو گیا، ریاست کی تشکیل کا کام گینگ کلچر کا شکار ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ریاست فوج ہی کو سمجھا جانے لگا۔ عمومی تاثر یہی ہے کہ سیاستدانوں اور فوج کے درمیان اقتدار کی کشمکش سے ریاست کمزور ہو گئی۔ حالانکہ پاکستان میں ریاست کبھی تشکیل ہی نہ پا سکی۔ اور اقتدار کیلئے فوج اور سیاسی قوتوں میں جاری کشمکش بھی ریاستی ڈھانچے کو کھڑا کرنے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ کشمکش بھی گینگ کلچر کا شکار ہو گئی۔ اور اس نے بھی ریاستی تشکیل کو مزید ناممکن بنا دیا۔ گینگ کلچر کیا ہے؟ یہ کس طرح ریاست کو ناکام بناتا اور تخریب کو فروغ دیتا ہے؟ اس دو سوالوں کے جوابات مل جائیں تو یہ معلوم کرنے میں آسانی ہو گی، کہ ضرب عضب صحیح طریقہ کار ہے یا غلط؟

گینگ کلچر سیاست اور بیوروکریسی ہی میں نہیں بلکہ پاکستان کے پسماندہ علاقوں اور خود فوج کے ادارتی ڈھانچے میں بھی سرایت کر چکا ہے۔ اس کلچر کے زیر اثر ایک جانب ریاستی تشکیل کمزور پڑتی ہے، دوسری جانب تخریبی قوتوں کے فروغ کا فائدہ اٹھانے والی قوتوں کو تقویت ملتی ہے۔ ظاہر ہے، بیوروکریسی اور سیاست میں سرایت کر جانے والے گینگ سیاسی اور انتظامی ماحول کو تخریبی گینگ کے لئے مزید موافق بناتے ہیں، جبکہ فوجی ادارے کے اندر کا گینگ تخریبی گینگ کے ساتھ بڑھتے ہوئے روابط سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب یہ روابط پختہ ہو جاتے ہیں، تو تخریب صنعت بن جاتی ہے، جسے صرف صنعتی قطع تعلقی کے اصولوں کے تحت ہی ناکارہ بنایا جا سکتا ہے۔

ہر صنعت کی شروعات اور خاتمہ بالخیر کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ لیکن جو مرکزی اصول سب پر حاوی ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ صنعت کے انتظامیہ کو ختم کر دیا جائے۔ ضربِ عضب صرف اس صنعت کے کارندوں کے خاتمے کی کوشش کے طور پر سامنے آیا، اور وہ بھی صرف وزیرستان کے علاقے میں۔ قارئین کو یاد ہوگا، کہ جب سوات آپریشن کیا گیا، تو کراچی، پشاور، قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں صورتحال مزید بگڑ گئی۔ فوج اور سیاسی ادارے یہ سمجھتے رہے، کہ وزیرستان ساری مصیبت کی جڑ ہے۔ جن قوتوں کو "اثاثے" کہا جاتا ہے، ان کا پھیلاؤ پاکستان کے ہر کونے کھدرے میں ہے۔ خصوصاً کراچی اور بلوچستان میں۔ وہاں آپریشن ہوئے، لیکن نتیجہ الٹا نکلا۔

ضرب عضب مسئلے کا حل نہیں۔ اس آپریشن کے دوران عوام کو یہ نہ بتایا گیا کہ تخریبی ڈھانچے اور اس کو چلانے والے کن کن سرکردہ افراد کو مارا یا پکڑا گیا۔ اس سے یہ آپریشن مشکوک ہو گیا۔ دوسری جانب ڈرون حملوں کے شکار افراد کی تصویریں تک دکھائی جاتی رہیں۔ لیکن ضرب عضب کو مسلسل دیکھنے والے یہ سمجھ سکتے ہیں، کہ تخریبی ڈھانچے کو توڑنے کے لئے ان افراد کو پکڑا یا مارا جانا بنیادی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو یہ سمجھا جائیگا، کہ درحقیقت ان سرکردہ لوگوں کو بحفاظت کہیں اور منتقل کیا جا رہا ہے۔ ایسا تاثر خطرناک ہوگا۔ پھر یہ کہ ایسے سرکردہ لوگوں کی جگہ دوسرے لوگ بھی آ سکتے ہیں۔ انہیں روکنے کے لئے کیا ترکیب اختیار کی گئی، اس بارے میں آپریشن کرنے والے خاموش ہیں۔ جو اسلحہ بارود ملا، وہ بھی نہ دکھایا گیا۔ جتنا اسلحہ اب تک ٹیلیویژن پر دکھایا جا چکا ہے، اس سے تو پاکستان، یا پختونخوا اور قبائلی علاقوں میں اس بڑے پیمانے پر دہشت گردی ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔

ضرب عضب کو حکمت عملی کے لحاظ سے مشکوک اور نیم دلانہ کوشش ہی کہا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں تخریب کو کچلنے کے لئے، جو طریق کار درکار ہے، اس کے تقاضے سامنے لانے اور ساتھ ہی ساتھ اسے کامیاب بنانے کے لئے درکار ذرائع کی فہرست بنانے کے لئے از سر نو کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ضرب عضب ہمیشہ مشکوک رہیگی۔ مشکوک گینگ ختم کرنے اور ریاست کی کامیاب تشکیل سے ہی تخریب کے خاتمے کی ضمانت ملے گی۔ کوئی اور طریقہ کارگر نہ ہوگا۔

اس آپریشن کے شروع کرنے کا ماحول بہت مشکوک تھا۔ سیاسی قوتیں اول تو تخریبی تنظیموں سے مذاکرات کی وکالت کرتی رہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ فوج آپریشن پر یکسو ہے، تو انہوں نے بھی آپریشن کی حمایت شروع کر دی۔ یہ آپریشن اس اعلان کے بغیر شروع کیا گیا کہ مذاکرات ناکام ہو چکے ہیں۔ اور اگر مذاکرات ناکام ہو چکے تھے، تو اس کی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔ اسی باعث یہ خدشہ تقویت پا رہا ہے کہ آپریشن کا نتیجہ بھی مشکوک رہے گا۔

اسی آپریشن کے دوران پشاور کے پروفیسر اجمل کو رہا کر دیا گیا۔ انہیں تخریب کاروں نے قریباً تین سال قبل اغواء کیا تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا ان کے خاندان یا رفقاء نے کوئی رقم ادا کی یا پھر تخریب کاروں نے انہیں کسی دباؤ کے تحت چھوڑ دیا۔ آپریشن کے علاقوں سے طالبان میں پھوٹ پڑنے کی خبریں آ رہی ہیں۔ شاید اسی پھوٹ کے باعث اُن پر دباؤ پڑا ہو۔

مصنف نے اپنے ۳۵ سالہ صحافیانہ کیریئر کے دوران کاونٹر ٹیررازم
ٹیکس رپورٹنگ اور دیگر اقتصادی وسیاسی موضوعات پر کام کیا۔
اس میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

کیا خبر بکتی ہے؟

الہام کاکڑ

ایک وقت تھا جب ٹیلی ویژن دیکھنا فارغ وقت کے مشاغل میں شمار کیا جاتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ٹیلی ویژن ایک ضرورت بن چکا ہے اور روزانہ کی بنیاد پر قومی اور بین الاقوامی واقعات سے باخبر رہنے کے لیے نہایت ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی میڈیا کی آزادی کی وجہ سے ٹیلی ویژن چینلز کی فہرست میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دوستوں اور رشتہ داروں سے یہ اکثر سننے کو ملتا ہے کہ انھوں نے نیوز چینل دیکھنا بند کر دیے ہیں کیونکہ اس سے وہ ڈپریشن کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ دلچسپی کی کمی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ نیوز چینلز ناظرین کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہے۔

موجودہ حالات میں میڈیا نے ایک ادارے کی شکل اختیار کر لی ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نجی نیوز چینلز میں اضافے کی وجہ سے آپس میں نیوز چینلز میں مقابلہ کافی حد تک بڑھ گیا ہے۔ آجکل میڈیا کے کردار کی تعریف بھی کی جاتی ہے لیکن میڈیا کو تنقید کا سامنہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ بہتر ریٹنگ حاصل کرنے کی دوڑ میں کئی نیوز چینلز اپنی خبروں میں تعصب کا رنگ بھرتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے میڈیا ایک ہی مسئلے کو بہت اہمیت دیتا ہے اور دوسری خبروں پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی، بے شک وہ خبر عوام کے لیے کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو۔

پاکستان تحریک انصاف اور عوامی تحریک کے دھرنوں کو جو میڈیا نے توجہ دی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میڈیا دوسری خبروں کو اہمیت نہیں دے رہا ہے۔ نیوز چینلز نے اپنے ناظرین کو عوامی تحریک اور تحریک انصاف کے مارچز کی ہر تفصیل سے آگاہ کیا جو ۱۴ اگست ۲۰۱۴ء کو لاہور سے شروع ہوئی تھیں۔ ہر شخص نے خاندان اور دوستوں سمیت ان دھرنوں کے بارے میں گفتگو کرنا شروع کر دی ہے۔ میڈیا کی اِن سیاسی دھرنوں کو دی گئی غیر ضروری توجہ کی وجہ سے کوئٹہ میں سمنگلی ایئر بیس اور خالد ایئر بیس پر عسکریت پسندوں کے حملے کو بہت کم توجہ دی گئی جہاں شدید فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور دھماکے بھی ہوئے۔ ان عسکریت پسندوں کے خلاف آپریشن اگلے دن صبح تک جاری رہا جس میں ۱۱ سیکورٹی اہلکار زخمی ہوئے لیکن اس خبر کو انقلاب اور آزادی مارچز کے مقابلے میں کم اہمیت دی گئی۔

شمالی وزیرستان کے بے گھر افراد نے ۲۱ اگست کو پشاور پریس کلب میں تحریک انصاف اور عوامی تحریک کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کیلئے کانفرنس کا انعقاد کیا۔ مظاہرین سڑکوں پر نکل آئے اور شور مچانے لگے کہ جو جماعتیں حکومت کے خلاف احتجاج کر رہی ہیں ان کو اہمیت دی جا رہی ہے لیکن ان کے مسائل پر توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ مظاہرین نے اس بات پر زور ڈالا کہ صوبائی حکومت ان کو تنہا چھوڑ چکی ہے اور یہ صرف اپنے سیاسی مقاصد کو فروغ دے رہی ہے۔ مظاہرین نے اِس

عزم کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اگر حکومت ان کے مسائل حل نہیں کرتی تو وہ اسلام آباد کی طرف مارچ کریں گے۔ بے گھر افراد کی اپیل نظر انداز کرتے ہوئے نیوز چینلز نے پاکستان مسلم لیگ ن اور دیگر جماعتوں کے تحریک انصاف اور عوامی تحریک کے خلاف مظاہروں پر توجہ مرکوز رکھی۔

۲۳ اگست ۲۰۱۴ء کو وزیر اعظم نواز شریف نے پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین اور سابق صدر آصف علی زرداری سے تحریک انصاف اور عوامی تحریک کے حکومت کے خلاف دھرنوں کے سلسلے میں ملاقات کی۔ اس سلسلے میں جس خبر پر ہر نیوز چینل نے زور دیا وہ کھانے کا شاہانہ مینیو تھا جس میں ۷۰ پکوان شامل تھیں جس میں ہرن کا گوشت بھی تھا، اس کے علاوہ ۲۸ میٹھے پکوان بھی تھیں جو آصف علی زرداری کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ اس شاہانہ مینیو کے جواب میں سابق صدر آصف علی زرداری نے وزیر اعظم سے کہا کے جمہوریت کو پٹری سے نہ اترنے دینا۔ اسی دن اسلام آباد کے ریڈ زون کے علاقے میں دہشت گردی کے واقعات سے بچنے کے لیے حفاظتی اقدامات سخت کر دیے گئے تھے۔ اس خبر کو نیوز چینلز نے اتنی بار چلایا کہ وہ ایک نہایت اہم خبر بن گئی۔ جو خبر اس کی وجہ سے نظر انداز ہوئی وہ اُسی دن جنوبی وزیرستان کے وانا بازار کے قریب ایک بم دھماکا تھا جس میں دو راہگیر زخمی ہوئے۔ اس کے علاوہ لشکر اسلام کے سابقہ ترجمان زر خان آفریدی جسے دو ہفتے پہلے اغوا کیا گیا تھا وہ خیبر ایجنسی میں مردہ پائے گئے۔

اگست ۲۰۱۴ء سے ہمارے ملک میں صرف عوامی تحریک اور تحریک انصاف کے دھرنوں پر ہی توجہ دی جا رہی ہے جس نے نا صرف پاکستان کے عوام کی توجہ اس طرف مرکوز کی ہوئی ہے بلکہ بین الاقوامی ادارے جو ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر میں کمی کرتے ہیں ان کی بھی توجہ اس طرف مرکوز کی ہے۔ پاکستان کے الیکشن کمیشن کے سابق ایڈیشنل سیکرٹری افضل خان نے ایک نجی نیوز چینل میں بتایا کے ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں دھاندلی ہوئی۔ اس خبر کو بہت اہمیت دی گئی اور کوئٹہ کے ہوٹل اور سبی کے ریلوے اسٹیشن میں کوئٹہ راولپنڈی کی ٹرین پر دھماکوں کے واقعات کو نظر انداز کیا۔ اس کے علاوہ جمرود سب ڈسٹرکٹ کے علاقے وزیر ڈھنڈ میں کارخانو چیک پوسٹ کے قریب آئل ٹینکر پر حملے کی خبر جس میں دو ڈرائیور مارے گئے تھے اس کو بھی نظر انداز کیا گیا۔ حتی کہ نیوز چینلز نے سینئر صحافی ارشاد مستوئی کی ہلاکت اور جناح روڈ کوئٹہ پر فائرنگ جیسے واقعات پر بھی توجہ نہیں دی۔

میڈیا کی ان مارچوں کو زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے ہمیں ہلاکتوں اور دھماکوں کی خبریں اخبارات کے سامنے والے صفحات پر نظر نہیں آتی ہیں۔ مظاہرے کرنے والی سیاسی جماعتوں اور حکومت کے درمیان لڑائی نے ہر اس خبر کو نظر انداز کیا ہے جو کسی بھی عام دن میں بریکنگ نیوز بن سکتی ہے۔ میڈیا کو یہ

احساس ہونا چاہیے کہ جانبدار رویے سے معاشرے میں انتشار کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ آج کے دور میں میڈیا تعین کرتا ہے کے کون سی خبر ہمارے لیے زیادہ اہم ہے، مندرجہ بالا خبریں الیکٹرونک میڈیا پر ایک عام خبر کی صورت میں ابھریں ان پر زیادہ تبصرے اور باقاعدہ پروگرام کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

تحریک انصاف اورعوامی تحریک کے دھرنوں کی وجہ سے جوواقعات نظرانداز ہوئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔عسکریت پسندوں کی طرف سے کوئٹہ کے سمنگلی ایئربیس اور خالد ایئر بیس پر شدید فائرنگ ہوئی۔اس آپریشن میں ۱۱ سیکورٹی اہلکارزخمی ہوئے۔

۲۔شمالی وزیرستان سے بے گھر افراد نے ۲۱ اگست کو پشاور پریس کلب میں تحریک انصاف اورعوامی تحریک کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کیلئے پریس کانفرنس کا انعقاد کیااور شکوہ کیا کہ وہ مشکل میں ہیں جب کہ سیاسی جماعتیں اپنے سیاسی مقاصد کوفروغ دے رہی ہیں۔

۳۔جنوبی وزیرستان ایجنسی میں وانا بازار کے قریب بم دھماکا ہوا جس میں دو راہگیر زخمی ہوئے۔

۴۔زرخان آفریدی عسکریت پسند گروپ لشکراسلام کے سابقہ ترجمان تھے جن کودو ہفتے پہلے اغوا کیا تھا وہ خیبرایجنسی میں مردہ پائے گئے۔

۵۔سبی ریلوے اسٹیشن میں کوئٹہ راولپنڈی کی ٹرین پر حملے میں تین لوگ زخمی ہوئے۔

۶۔کوئٹہ کے ہوٹل میں نامعلوم افراد کے دستی بم حملے سے ۱۶ لوگ زخمی ہوئے اورایک شخص ہلاک ہوا۔

۷۔جناح روڈ ،کوئٹہ پر فائرنگ کے سلسلے میں سینئرصحافی ارشادمستوئی اور ایک اورشخص کی ہلاکت ہوئی۔

۸۔جمرود سب ڈسٹرکٹ کے علاقے وزیر ڈھنڈ میں کارخانو چیک پوسٹ کے قریب آئل ٹینکر پر حملے میں دو ڈرائیور مارے گئے۔

مصنفہ انڈویجوئل لینڈ پاکستان میں کمیونیکیشن آفیسر کی حیثیت سے کام کررہی ہیں۔
میگزین یامضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

میڈیا اور دھرنا

اکرام ہوتی

ستمبر ۲۰۱۴ء کے آخری ہفتے میں ایک دو سیاستدانوں نے برملا اور بعض نے نجی محفلوں میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر میڈیا لانگ مارچ اور دھرنے کو ۷/۲۴ کوریج نہ دے، تو یہ اپنی موت آپ مر جائیگا۔

جو دھرنا ماڈل ٹاؤن میں قتل ہونے والے ۱۴ افراد کا بین کرتا اور نیا پاکستان مانگتا "ٹھاٹھیں مارتا انسانوں کا سمندر" کہلایا، اس کا میڈیا تین زاویوں سے کوریج کرنے پر مجبور تھا۔

اول، انسانوں کے ایک جم غفیر پر سیاسی تفسیر
دوم، اس جم غفیر پر انسانی زاویوں سے کمنٹری
سوم، اس سرگرمی کا عسکری، سیاسی زاویئے سے تجزیہ

جو سامنے نظر آ رہا تھا اور تقریروں میں عمران خان اور طاہر القادری سیاست اور سیاست دانوں کے بارے میں انکشافات کر رہے تھے، وہ دکھانا میڈیا کے لئے اہم تھا۔ پھر خواتین اور نوجوانوں کا سیاسی ترانوں پر رقص، یا پھر سیاسی ماتم پر آنسو بہاتے دکھانا بھی میڈیا کے لئے ضروری تھا۔ یہی تو وہ آپٹکس ہیں، جنہیں بی بی سی اور سی این این بھی دکھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پھر ان اقساط کو میڈیا کس طرح نظر انداز کر دیتا، وہ بھی ایسی صورت میں، کہ ٹیلیویژن دیکھنے کی شرح دوگنی تگنی ہو چکی تھی اور اخبارات کی فروخت کم از کم دوگنی ہوگئی تھی۔

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میڈیا اس کوریج پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک وہ جو لانگ مارچ اور دھرنے کی حمایت میں عسکری قوتوں کو مداخلت کی کھلم کھلا دعوت دینے کی حد تک جا پہنچا۔ دوسرا حصہ محتاط رہنے اور اس "سازش" کو بے نقاب کرنے میں لگ گیا، جو ان کے خیال میں دو جماعتوں کے ایک مخصوص موقع پر ایک ہی حساس شاہراہ کی طرف بڑھ کر براجمان ہونے کے پیچھے کارفرما تھی۔

نا تو میڈیا لانگ مارچ اور دھرنے کے سیاسی پہلوؤں کو نظر انداز کر سکتا تھا، اور نا ہی وہ میڈیا جو اسکو سازش خیال کر رہا تھا وہ اس "سازش" کو نظر انداز کر سکتا تھا، وہ بھی ایسی صورت میں جب سیاسی جماعتوں کی گروہ بندیاں ہو چکی تھیں۔ تجزیہ کاروں نے ٹیلیوژن پر اور اخباری کالموں میں اس دوران "سازش"، "جمہوریت" اور "عسکری حلقوں" کے بارے میں جو نئی باتیں عوام کو بتائیں، وہ پہلی بار پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد کے نوٹس میں آئیں۔ یہ ایک بے مثال موقع تھا، جس میں میڈیا کی استعداد اور قباحتوں کو بھی کھل کر سامنے آنے کا موقع ملا۔ تجزیہ کار بھی تین حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصے نے ایک طویل ظلم کی داستان کو بیان کیا، جو لانگ مارچ اور دھرنے کے پیچھے رقم ہوتی رہی۔ دوسرے حصے نے عمران خان اور طاہر القادری کے مطالبات کو موضوع بحث بنایا، اور یہ فیصلہ دینے کی کوشش کی، کہ یہ ناممکن مگر جائز مطالبات ہیں۔ تیسرے نے ان دو لیڈروں کے مطالبات کے مقابلے میں اُن گیارہ جماعتوں کے نکتہ نظر کو زیادہ اہمیت دی، جو یہ مطالبہ کر رہی تھیں، کہ "عسکری قوتوں کی مداخلت" کی گنجائش نہیں نکلنی چاہئے، خواہ صورتحال جو بھی بنے۔ ماضی میں بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ نصرت بھٹو نے بھی لانگ مارچ کیے۔ انھوں نے ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء میں جو لانگ مارچ کیے وہ بے نتیجہ رہے۔ تاہم نواز شریف کی حکومت کو دھچکا ضرور لگا۔ جنرل وحید کاکڑ نے ایک فارمولے کے تحت صدر غلام اسحاق خان اور نواز شریف دونوں کو ایسے حالات میں استعفیٰ دینے پر مجبور کیا جب بے نظیر بھٹو کی تحریک بھی وزیر اعظم پر دباؤ کا باعث بنی۔

اس دوران میڈیا نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ شاہراہ دستور اور اس کے گرد و نواح میں بدبو پھیل گئی ہے، غلاظت کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ اور پھول پتیوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ تاہم، زیادہ توجہ اس خدشے پر مرکوز رہی، کہ کہیں "بوٹوں کی چاپ" نہ سنائی دینے لگے۔

میڈیا کے ایک حصے نے ڈاکٹر قادری اور عمران خان کے ماضی کو مخاصمانہ انداز میں کھنگالا، اور یہ دلیل سامنے لانے کی کوشش کی کہ یہ دو حضرات مشکوک ماضی میں اسٹیبلیشمنٹ کے مہرے بن کر کام کرتے رہے ہیں۔ آیا ان کے مطالبات اتنے متاثر کن تھے کہ ان کے مشکوک ماضی کو نظر انداز کر دیا جائے؟ اس پر بحث بہت کم ہوئی۔ اس پہلو کو بھی زیادہ موضوعِ بحث نہ بنایا گیا کہ جن مخصوص حالات میں یہ لانگ مارچ اور دھرنے منعقد کیے گئے، وہ کیا تھے۔ ظاہر ہے میڈیا کی استعداد اور مباحثوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس قدر باریک بینی کی توقع نہیں ہوسکتی۔

دھرنے کے دسویں روز البتہ عسکری حلقوں کی "خاموشی" موضوعِ بحث بننے لگی۔ اس خاموشی کے طلبگار اور مخالفین کے درمیان مقابلہ شروع ہوگیا۔ جو کہ دو قسم کا تھا۔ ایک یہ، کہ یہ خاموشی کب ٹوٹے گی؟ دوسرا یہ، کہ خاموشی کا ٹوٹنا کتنا جائز ہوگا، اور کتنا ناجائز۔ اس مرحلے پر بھی تجزیئے کی غربت صاف محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ گہرے تجزیئے کے لئے صرف ماضی کا مشاہدہ اور سیاسی قوتوں کی توانائی ہی پر نظر رکھنا ضروری نہ تھا بلکہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری تھا کہ پاکستان اپنی جغرافیائی حیثیت کا فائدہ یا نقصان کس قدر اٹھا رہا ہے۔ اور جمہوری سفر میں پاکستان کہاں کھڑا ہے؟ یہ بھی کہ انتخابی دھاندلی کے بارے میں دیئے گئے تاثر سے عوام کس قدر محظوظ یا منفی طور پر متاثر ہو رہے تھے۔ اور سول سوسائٹی کی انقلاب یا نئے پاکستان کے نعرے سے کس قدر وابستگی بن چکی ہے۔ اور پھر یہ کہ اگر فوج مداخلت کرتی ہے، تو اسے سول سوسائٹی اور عوام میں کس قدر قبولیت حاصل ہوگی۔ میڈیا نے سیاسی جماعتوں، وکلاء کے اداروں اور تنظیموں، تاجر برادری کے خدشات اور انقلابی نعروں کے کھوکھلے پن کے درمیان تقابلی جائزے کی ضرورت سے بھی انصاف کرنے کی کچھ زیادہ کوشش نہ کی۔

میڈیا کوریج کے بارے میں اسلام آباد اور لاہور میں چند بیٹھکوں میں ہونے والے تبصروں سے یہ محسوس ہوا، کہ نواز، شہباز حکومت نے جو لانگ مارچ اور دھرنے کو اس قدر ڈھیل دی، اس کے بارے میں حقیقت پسندانہ تجزیہ بہت کم سامنے آیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا، کہ پہلے تو کنٹینرز لگائے گئے اور گرفتاریاں ہوئیں، اور پھر دھرنے کو شاہراہ دستور اور ڈی چوک میں جگہ مل گئی۔ اور یہ سب کچھ تین دنوں کے اندر اندر ہوگیا۔ حکومت اپنی جمہوریت پسندی کا ڈھنڈورا کرتی رہی، جبکہ عمران خان اور قادری لانگ مارچ کی ناقابل شکست قوت کا دعویٰ کرتے رہے۔ بعد میں یہ ہوا، کہ دھرنے میں شامل لوگوں کی گنتی پر توجہ مرکوز ہوگئی۔ اس موقع پر بھی میڈیا نے یہ سوال نہ اٹھایا، کہ اس قدر قلیل مجمع کے ساتھ وہ "قوت" عمران اور قادری کو کس طرح حاصل ہوئی کہ وہ آسمان سے تارے توڑ لانے کے دعوے کرنے لگے؟ یہ پہلو بھی زیادہ زیر بحث نہ آیا۔

میڈیا کی اس قباحت نے ساری صورتحال کو مزید مشکوک بنا دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ ایسی مشکوک صورتحال میں عسکری قوتوں کی "خاموشی" کتنی مشکوک ہے۔ اس پر بھی تبصرہ کر لیا جاتا تو یہ تجزیہ سامنے آتا، کہ اس قدر مشکوک احتجاجی قوت کا سہارا لیکر، اگر عسکری قوتوں نے خاموشی توڑی، تو وہ کس قسم کی ہوگی، اور اسے کس قدر قبولیت حاصل ہونے کا امکان ہے۔

جو ایک بہتر پہلو اس ساری صورتحال میں سے نکلا، وہ یہ تھا، کہ میڈیا پر تجزیہ کاروں نے موجودہ "جمہوری قوتوں" اور ممکنہ "عسکری مداخلت" کا تقابلی جائزہ لیا۔ لیکن یہاں بھی یہ تشنگی رہ گئی۔ یہ نہ بتایا گیا کہ عسکری قوتوں کی روایتی بے صبری اور جمہوری کہلانے والی قوتوں کی تاریخی قباحتوں کو ختم کرنے کے کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ عوام ایسے مباحث سے سیاسی پختگی حاصل کرتے ہیں۔ ایسے مباحث تجزیاتی پختگی کے بغیر ممکن نہیں لیکن میڈیا اس تقاضے سے بے خبر نظر آیا۔

اب آیئے اس نکتے کی جانب، جو اس قضیے میں سب سے زیادہ اہم ہے، اور جس نے میڈیا کو واضح طور پر امتحان میں ڈال دیا۔ یہ نکتہ وزیراعظم کے استعفیٰ کے بارے میں ہے۔ ایک دلیل یہ تھی، کہ استعفیٰ دیکر ماڈل ٹاؤن کے سانحے اور انتخابی دھاندلی کی تحقیقات کو شفاف بنانے کا یقین دلایا جائے۔ یا پھر وزیراعظم ایک ماہ کے لئے رخصت پر جا کر یہ تقاضا پورا کریں۔ میڈیا کا ایک حصہ اس پر مصر رہا کہ استعفیٰ دینے یا وزیراعظم کے رخصت پر چلے جانے سے کوئی مثبت فرق نہیں پڑے گا۔ بلکہ یہ حصہ اس حد تک چلا گیا، کہ ایک داغدار وزیراعظم کا تو اپنے عہدے پر بحال رہنا بھی ناجائز ہے۔ لہذا بے رحمانہ قسم کی

جواب طلبی کے بغیر وہ انصاف حاصل نہیں ہوسکتا جس کا مطالبہ عمران خان اور ڈاکٹر قادری کر رہے تھے۔ دوسری جانب میڈیا پر تجزیہ کاروں اور گیارہ سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کا نکتہ نظر یہ تھا، کہ عدلیہ کے حکم کے بغیر استعفیٰ دینے سے ایک خطرناک روایت قائم ہو جائے گی۔ ایسے میں سب سے زیادہ معنی خیز اور واضح بیان سپریم کورٹ کے ججوں کی جانب سے آیا۔ جسٹس ظہیر جمالی اور جواد خواجہ نے کہا کہ استعفیٰ کا مطالبہ اور دھرنے کے شرکاء اور لیڈروں کا رویہ آئین اور قانون سے متصادم ہے۔ یہاں تک کہہ دیا گیا، کہ "ھڈیوں کے معالج نے چار مرتبہ دماغ کی سرجری کی (فوجی حکومت کا قیام) اب ایسا نہیں ہونا چاہئے"۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا، کہ جب دھرنے کے شرکاء پر رہنماؤں کا کنٹرول نہ ہو، تو ان کی حرکات کو قانون کے زور پر محدود کرنا آئینی تقاضا ہے۔

میڈیا کے جو عناصر استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے تھے، انہیں چہار اطراف سے معاندانہ رویئے کا سامنا ہوا، تو انہوں نے بجائے دلیل کا راستہ اپنانے کے، مزید سکینڈل سامنے لا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی، کہ دھاندلی ہوئی، اور سانحہ ماڈل ٹاؤن پر (ایف۔آئی۔آر) درج نہ ہونے پر استعفیٰ دینا ضروری ہے۔ جو بہتر پہلو میڈیا کو ریج کا سامنے آیا، وہ یہ اصرار تھا کہ (ایف۔آئی۔آر) درج ہونا ضروری ہے۔ اگر میڈیا ایسا اصرار کرتا رہا، تو شاید بہتری کی کوئی صورت نکلے۔

ڈیلی ٹائمز نے اپنے ۲۷ ستمبر کے اداریئے میں اس امر کا نوٹس لیا کہ مختلف ٹیلیویژن چینلز اپنی پالیسی کے مطابق تجزیہ کاروں کو مدعو کرتے رہے۔ یہ ایک جائز نوٹس ہے جو اس اخبار نے لیا۔ لیکن زیادہ تر بحث چار انتخابی حلقوں پر مرکوز رہی۔ عمران خان نے ان چار حلقوں کا آڈٹ کرانے کا مطالبہ کیا، لیکن دس ماہ تک یہ مطالبہ نہ مانا گیا۔ میڈیا نے اس دلیل پر زور دیا، کہ عمران خان کا مطالبہ نہ ماننے کے باعث حالات بگڑ گئے۔ یہاں میڈیا نے مثبت کردار ادا کیا۔

۱۹ اگست کو جب عمران خان اور ڈاکٹر قادری نے ریڈ زون میں اپنے قافلے داخل کرنے کا اعلان کیا، تو واضح ہونے لگا، کہ یہ دونوں لیڈر صرف چند ہزار لوگوں کی طاقت سے نہیں بلکہ غیر مرئی تعاون سے بھی حوصلہ پا چکے ہیں۔ پہلے ان دونوں نے سیاسی اخلاقی طور پر نواز حکومت پر برتری حاصل کی اور پھر چند ہزار افراد کو اکٹھا کیا، پھر ان قافلوں کو ریڈ زون میں داخل کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان کے سامنے نہ تو پولیس کھڑی ہوگی اور نہ ہی فوج۔

دونوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ان کے "جائز" مطالبات کو پولیس اور فوج تسلیم کرتی ہے۔ وہ یہ بات چھپا رہے تھے کہ انہوں نے احتجاجی قافلے ہی غیر مرئی تعاون سے کھڑے کئے، اور سارا اسکرپٹ پہلے ہی سے موجود تھا۔ میڈیا نے اس پہلو پر درکار تجزیہ کرنے میں ناکامی دکھائی۔ البتہ یہ واضح ہے، کہ جب "ایمپائر کی انگلی" کے بارے میں عمران خان نے نعرہ بلند کیا تو میڈیا نے فوراً "ایمپائر" فوج کو قرار دیا۔ ایسا پاکستانی میڈیا کی تاریخ میں پہلی بار ہوا، کہ فوج کے آنے کی کسی سیاستدان نے دھمکی لگائی، تو اسے آڑے ہاتھوں لیا گیا۔ اس ردعمل پر میڈیا مبارک باد کا مستحق ہے۔

مصنف نے اپنے ۳۵ سالہ صحافیانہ کیریئر کے دوران کاونٹر ٹیررازم ٹیکس رپورٹنگ اور دیگر اقتصادی و سیاسی موضوعات پر کام کیا۔
اس میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

سیلاب اور منصوبہ بندی

سندس سیدہ

ستمبر ۲۰۱۴ء میں آنے والے سیلاب نے ایک دفعہ پھر سینکڑوں آبادیاں تباہ کر دیں، کئی بستیاں اجڑ گئیں، نہ صرف مالی بلکہ جانی نقصان کی بھی حد نہیں رہی، فصلیں تباہ ہوگئیں، مال مویشیوں کو سیلاب کا پانی اپنے ساتھ بہا تا چلا گیا۔ سینکڑوں انسانی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ سیلاب کی یہ صورتحال تھی کہ کھنہ پل کے پیچھے موجود بستی کے گھروں کے ایک ایک منزل پوری طور پر ڈوب چکی تھی۔ اسکول میں لگے والی بال کے پول نظر نہیں آ رہے تھے۔ ابھی لوگ اسی اثناء میں تھے کہ اپنے پیاروں کے حالات دریافت کریں کہ اس بستی کی فضاؤں میں پرواز کرنے والے آرمی کے ہیلی کاپٹروں نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا جو کہ گھروں کی چھتوں سے لوگوں کو اتار کر کسی محفوظ مقام کی جانب منتقل کرنے میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

یہ تو تھی سیلاب کے فوراً بعد کی صورتحال، اس سے پہلے کی صورتحال بھی یقیناً ویسی ہی ہوگی جو کہ عموماً ہوتا ہے رات کو الارم بجائے گئے ہوں گے اور مساجد میں اعلانات ہوئے ہوں گے، لوگوں نے افراتفریح کے عالم میں اپنا قیمتی سامان چھتوں پر منتقل کرنے کی کوشش کی ہوگی جہاں آسمان سے برستا پانی اور زمین سے ان کی زندگی کی جمع پونجی کے طرف آتے سیلابی ریلے شاید ان کی ان کوششوں کی پرواہ کیے بغیر اپنی تباہ کاریاں پھیلاتے چلے گئے ہوں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے قدرتی آفات سے نمٹنے کے صوبائی ادارے آخر کیا کر رہے ہیں؟۔ جیسے ہی مون سون کا موسم شروع ہوتا ہے، پہلے سے زیادہ بارشوں کی پیشنگوئی کی جاتی ہے، نہ جانے اسکو اتنی اہمیت کیوں نہیں دی جاتی کہ جب تک دریاؤں اور ڈیموں کی سطح اتنی بلند نہیں ہو جاتی کہ یہ بارشوں کا پانی سیلاب کی صورت اختیار کر کے لوگوں کو اپنے ساتھ بہا تا چلا جائے تب تک کوئی عملی اقدامات نہیں اٹھائے جاتے۔ نا جانے برطانوی نہری نظام پر کب تک

ہمارا گزارا چلتا رہے گا؟ نہ جانے کب ہم پانی کو مزید ڈیم بنا کر محفوظ کرنے کے قابل ہوں گے؟ نا معلوم ایسا ہی کیوں ہوتا ہے کہ فیڈرل فلڈ کمیشن اور دوسرے محکموں کی رپورٹیں بروقت منظرِ عام پر نہیں آتیں اور اگر آ بھی جاتی ہیں تو ان پر کوئی نوٹس لیا نہیں جاتا جب تک حالات بگڑ نہ جائیں۔

دریاؤں کے کنارے پر بسنے والی بستیاں جو کہ ہر سال سیلاب سے تباہ ہو جاتی ہیں، جن کے مویشی مر جاتے ہیں، گھر تباہ ہو جاتے ہیں اور گھر میں بسنے والے مکینوں کو سیلاب کا پانی کہیں بہا لے جاتا ہے۔ ابھی اپنے سے پیاروں سے جدائی کا، اپنے گھر بار، مال مویشیوں کی تباہی کا غم بھی غلط نہیں ہوا ہوتا کہ دوبارہ ان کو ان ہی حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک ہی آبادی ہر سال سیلاب سے متاثر ہوتی چلی جاتی ہے اور غریب سے غریب تر ہوتی چلی جاتی ہے، ان سے قدرتی آفات سے نمٹنے کی صلاحیتیں دم توڑتی چلی جاتی ہیں۔ جن کی گزر بسر اپنے مال مویشیوں کو پال کر ہوتی ہے ان کا یہ اثاثہ بہہ جانے سے غربت ان کے گھروں میں ڈیرے ڈال لیتی ہے اور ملکی سطح پر بھی غربت کا تناسب بڑھتا چلا جاتا ہے۔

سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اب سیلاب جیسی قدرتی آفت سے نمٹنے کے لیے پہلے سے اقدامات کیے جا سکتے ہیں اور اس سے ہونے والے نقصان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں سیلاب سے قریب تر علاقوں میں آبادیاں نہیں بسنے دی جاتیں یا پھر ان کے گھروں کو ایسے بنایا جاتا ہے کہ سیلاب کا پانی ان کو نقصان نہ پہنچائے، وہیں پاکستان جیسے ملک میں دریاؤں کے گرد بسنے والی آبادیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک ریلا اپنے ساتھ ہی سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے، اور پھر حالات یہ ہو جاتے ہیں کہ ہر سال وہاں سے سیلابی پانی گزرتا ہے تو وہ لوگ جو نیم پختہ مکانات میں سر چھپائے بیٹھے ہیں اُن پر آہستہ آہستہ، کچے مکانات اور پھر خیمے میں سر چھپانے تک کے حالات آ جاتے ہیں اور کبھی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ان کو خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرنا پڑ جاتی ہے۔

نہروں کی بھل صفائی کے لیے ایک خاص رقم مختص کی جاتی ہے۔ ایک عام شہری کے ساتھ ساتھ عوام کو آگاہی دینے والے ادارے میڈیا کا کام ہے کہ وہ آج کے دور میں رائیٹ ٹو انفارمیشن (جاننے کا حق) کے تحت معلومات لے کر عوام تک اور متعلقہ اداروں تک پہنچائیں کہ یہ بجٹ استعمال میں لایا جا رہا

ہے یا نہیں۔ زیادہ بارشوں کے بارے میں کی جانے والی پیش گوئی کے بعد کیے جانے والے اقدامات سے لوگوں کو آگاہ کرے، اور اگر کوئی انتظامات نہیں کیے گئے تو اس کو منظرِ عام پر لائے۔

جہاں پہلے سے زیادہ بارشوں کی پیشنگوئی کی جائے اور پانی کی سطح بلند ہونے کے امکانات پہلے سے موجود ہوں تو آخر عوام کو آدھی رات کو اعلانات کر کے خبردار کرنے کی نوبت کیوں آتی ہے؟ پہلے سے کوئی اقدامات کیوں نہیں کیے جاتے؟ جب سینکڑوں گھر تباہ ہو جاتے ہیں تو کیا سیلاب کے بعد کی تباہ کاریوں سے نمٹنے کے لیے کوئی خاص اقدامات کیے جاتے ہیں؟ کیا صرف راشن پہنچا دینا اور ان کو فوری امداد مہیا کرنا ہی نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی (این ڈی ایم اے) کا مقصد ہے؟ کیا ان کے کاموں میں ان علاقوں کو دوبارہ آباد کرنا شامل نہیں؟ کیا ہماری حکومت کا ان آبادیوں میں جا کر کبھی کیش ہونے اور کبھی باؤنس ہو جانے والے چیک بانٹ دینا ہی کافی ہے؟ یا پھر اگلے سال بھی ان ہی علاقوں کو سیلاب سے بچانے کے لیے پیشگی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے؟

سیلاب کی وجہ سے ملکی معیشت کو پہنچنے والے نقصانات عوام کو ایک طویل عرصے تک بھگتنے پڑتے ہیں۔ تعمیراتی ڈھانچوں کی بحالی نا صرف ملکی خزانے پر بوجھ بنتی ہے بلکہ ناقص تعمیرات سے اس بوجھ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سے ملک میں اشیاء کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ فصلوں کو پہنچنے والے نقصانات، مویشیوں کا بہہ جانا، خوراک کا مشکل حصول اور مہنگائی عوام کی کمر توڑ دیتی ہے۔

ہماری حکومت اور این ڈی ایم اے کو سیلاب سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ بستیوں کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی اور اقدامات اٹھانے کی ضرورت ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ جب تک ڈیم نہیں بن جاتے اور جب تک پانی کو ذخیرہ کر کے خرچ کرنے اور بجلی پیدا کرنے کا مناسب انتظام نہیں ہو جاتا تب تک یہ آبادیاں سیلاب سے اسی طرح متاثر ہوتی رہیں گی، اور ہم ان کی امداد کے لیے کبھی مقامی لوگوں کے دیے گئے عطیات اور کبھی دوسرے ممالک کے بھیجے گئے فنڈز سے کچھ امداد کرتے رہیں گے، جو کہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں اور فردر سالے کی ایڈیٹر بھی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

یہ کس کا لانگ مارچ تھا؟

اکرام ہوتی

پاکستان میں بڑے سیاسی فیصلے کس کی ایماء پر ہوتے ہیں؟

مندرجہ ذیل چار سوالات سے الجھ کر آپ کوئی حقیقت پسندانہ جواب تلاش کر سکتے ہیں۔

۱۔ یہ لانگ مارچ اور دھرنا کس موقع پر شروع ہوا؟
۲۔ کن مقاصد کے حصول کے لئے شروع ہوا؟
۳۔ کس کی ایماء پر شروع ہوا؟
۴۔ اس کا سیاسی نتیجہ کیا نکلے گا؟

میں نے لانگ مارچ اور دھرنے کے پروگرام کا پیچھا کرنا اس کے شروع ہونے سے قریباً ڈیڑھ ماہ پہلے شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں منہاج القرآن کے دفتر میں ڈاکٹر طاہر القادری سے ایک طویل ملاقات اس وقت ہوئی، جب وہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں دھرنے کی کال دینے والے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ معاشرے اور سیاست کے کن حصوں سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں اور سول سوسائٹی کے کن لوگوں نے لانگ مارچ اور دھرنے کی حمایت کی یقین دہانی دلائی ہے؟ ان کے جوابات کچھ ایسے تھے کہ مجھے ان کے ارادوں میں جلدی کا عنصر غالب محسوس ہوا۔ اسلام آباد واپسی پر میں نے ان کے جوابات اور ان میں جلدی کے عنصر کے بارے میں سوچا۔ اس دوران وہ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور نوجوانوں کا ایک مجمع لیکر ماڈل ٹاؤن میں واقع اپنے ہیڈ کوارٹر میں دھرنا دے چکے تھے، اور ان کے اردگرد کنٹینروں کا ایک شہر بسا دیا گیا تھا۔ اس ہیڈ کوارٹر کے آس پاس ۱۴ اہلاکتوں سے لے کر اگست کی ۲۹ تاریخ تک پاکستان میں ایک ایسا طوفان بدتمیزی کھڑا کیا گیا، جس میں نواز حکومت اور لانگ مارچ والوں کی جانب سے دھمکیوں اور سیاسی ناشائستگیوں کا وسیع و عریض تبادلہ ہوا۔ میں یہ سوچتا رہ گیا کہ یہ سب کس کے فائدے میں ہے۔ عمران خان تو یہ کہہ رہے تھے کہ وہ "نیا پاکستان" بنانے کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔

قادری صاحب فرما رہے تھے کہ وہ "انقلابی پاکستان" کو جنم دے رہے ہیں۔ لیکن میرا مشاہدہ بتا رہا تھا کہ "اسلام" اور "انقلاب" پاکستان میں پٹی ہوئی سیاسی اصطلاحیں ہیں۔ حتٰی کہ تخریب بھی جعلی جدوجہد کی انتہائی شکل ہے۔ ان تینوں کا فائدہ اٹھانے والی قوت پاکستان میں ایک ہی ہے۔ سیاسی لوگ اس دھندے میں کچھ بٹورنے کے لئے کوئلے کے کاروبار میں محض منہ کالا کرانے آتے ہیں۔ ماضی میں پیر پگاڑا کا "ڈبل مارچ" کا نعرہ، جنرل مشرف کے حاشیہ برداروں کا "سب سے پہلے پاکستان" کا نعرہ اور اب انقلاب اور نیا پاکستان۔ سیاسی حاشیہ برادری کے یہ مختلف نمونے صرف ایک مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ یعنی جمہوریت کو بدنام کرو، جمہوری جدوجہد کرنیوالوں کو بھگاؤ، ان کو اقتدار میں آنے سے روکو، اور اگر کوئی وسیع جمہوری اتحاد بن جائے، تو ان پر "کرپشن" اور "نااہلی" کا الزام اس طرح لگاؤ جیسے پاکستان میں آمریت نہیں بلکہ "جعلی جمہوریت" سب سے خطرناک مسئلہ ہے۔

اپنے مشاہدے کی بنیاد پر میں نے طاہر القادری سے پوچھا، "آپ سول سوسائٹی کو ساتھ لانے کے لئے کیا اقدامات پسند فرمائیں گے"؟ انہوں نے کہا "یہ سب سے اہم سوال ہے۔ کیا آپ ایک ایسا خلاصہ مجھے لکھ کر دے سکتے ہیں جو اس سلسلے میں سرگرمی میں مدد دے سکتا ہو؟ لیکن واضح رہے، ہمارے پاس وقت تھوڑا ہے۔ بلکہ ہے ہی نہیں"۔ میں نے پوچھا "فوج کے ساتھ اس سلسلے میں کس قسم کے روابط رکھنے کا ارادہ ہے؟" انہوں نے فرمایا "فوج کے بارے میں سوالات چھوڑ دیں۔ اس پہلو سے آپ کام نہ رکھیں۔ بس یہ انتظام کیسے ہوگا، کہ سول سوسائٹی ہمارے ساتھ آجائے۔ اس پر توجہ مرکوز کریں؟"

ان کی گفتگو سے ظاہر ہو رہا تھا کہ مولانا کسی جلدی میں ہیں۔ جیسے انہیں کوئی ایسا ٹاسک دے دیا گیا ہے جس کی تکمیل کے لئے وقت معین کر دیا گیا ہے۔ اُن کے جو مہمان گاہے بگاہے ملنے آ رہے تھے، ان سے گفتگو کرتے ہوئے وہ اپنی اس جستجو کو قطعاً چھپا نہیں پا رہے تھے کہ عمران خان کتنی قوت سے

لانگ مارچ کرے گا۔ اور یہ کہ پاکستان عوامی تحریک کو عوام اور اسٹیبلشمنٹ سے کس قدر حمایت حاصل ہو پائے گی۔ گویا اس لانگ مارچ میں دونوں جماعتوں کے درمیان اتحاد اور مقابلے کی ایسی فضا تھی جس میں دونوں لیڈر یہ ثابت کرنے کی کوشش میں تھے کہ "آزادی" یا "انقلاب" کے مارچ اور دھرنے میں سے جو بھی دوسرے کو پچھاڑ دے گا اس جدوجہد کے شروع کرنے والوں کی نظر میں اعلیٰ عہدے کا مستحق ہوگا۔ پھر جب ماڈل ٹاؤن کا دھرنا لانگ مارچ میں بدلنے لگا تو قادری نے نعرہ لگایا "جو اسلام آباد سے ناکام لوٹنے کی کوشش کرے، اسے بھی شہید کردو"۔ گویا وہ یہ اعلان کررہے تھے، کہ "میں تو مر جاؤں گا، ہدف حاصل کئے بغیر واپس نہ لوٹوں گا"۔

یہ ہدف کیا ہے؟ اس پر سوچتے سوچتے میں نے اپنے ذرائع سے مدد لینے کی کوشش کی۔ جو حضرات جانتے تھے کہ کیا ہورہا ہے، اور کس کی ایماء پر ہورہا ہے، وہ دانت نکال نکال کر تصدیق کررہے تھے کہ یہ دونوں لیڈر محض شطرنج کے مہرے ہیں۔ کھلاڑی کوئی اور ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے جب میں نے مزید کوشش کی تو معلوم پڑا کہ کہانی وہ نہیں جو سامنے نظر آرہی ہے۔ اس نظر آنے والی کہانی کے پیچھے ایک کھیل کھیلا جارہا تھا۔ وہ کھیل میرے حساب سے یہ تھا کہ یا تو نواز حکومت اور موجودہ نظام کو سرے سے منظر سے ہٹا دیا جائے، اور یا پھر اس حکومت کو اس قدر کمزور کردیا جائے کہ اس کو چند نامعلوم مقاصد کے حصول کے لئے کوشش کا آلہ کار بنا کر رکھ دیا جائے۔ ظاہر ہے، یہ کوئی بہت بڑے مقاصد ہونگے۔

۲۶ اگست کو میں نے ان مقاصد کے بارے میں ڈھونڈ لگانے کی کوشش کی تو جو کہانی سامنے آئی، اس کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش خدمت ہے۔ قادری صاحب کے پہلے دھرنے سے بہت پہلے یہ کوشش کی جارہی تھی، کہ پیپلز پارٹی اور نواز لیگ کو اس قابل نہ چھوڑا جائے کہ ان کا سیاسی اتحاد ہو۔ جو سیاسی کریٹیکل ماس اس اتحاد کے اردگرد ایک اکٹھا ہونے کا خدشہ تھا وہ ملک میں ایک ایسی قوت کو کھڑا کرسکتا تھا جو مستقبل میں ان عزائم کی راہ میں دیوار بن سکتا تھا، جن کو پورا کرنا ماضی میں اسٹیبلیشمنٹ کے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا تھا، لیکن اب اس کی راہ میں نواز لیگ اور پیپلز پارٹی کا اتحاد اور یہ کریٹیکل ماس حائل تھا، جو صوبائی سیاسی قوتوں پر مشتمل تھا۔

یہ "مقاصد" سیاسی، عسکری، جغرافیائی سیاسی و عسکری قسم کے تھے۔ سول سیاسی قوتوں کے ایک ایسے اتحاد کے سامنے، جو وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں بھی شامل ہوں، ان مقاصد کو پورا کرنا دشوار تھا۔ اور اگر اس دشواری کو دور نہ کیا گیا، تو مستقبل میں اس اتحاد کو ختم کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اس ناممکنات کے خوف نے مارچ اور دھرنے کی سیاسی جدوجہد کو نشانہ بنایا۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ عمران خان اور ڈاکٹر قادری اس انجام کو "نیا پاکستان" اور "انقلابی پاکستان" سے تشبیہ دیتے ہیں۔

اس مارچ اور دھرنے کے حملے کا جواب مسلم لیگ (ن) نے یوں دیا کہ آرمی چیف کو فسیلیٹیٹر بننے کا کہہ دیا۔ اپوزیشن جماعتوں اور میڈیا کی جانب سے اس حکمت عملی پر تنقید ہوئی۔ لیکن سیاسی جوابی حملے کے طور پر یہ ایک کارگر تدبیر ہے۔ اب اس کھیل کے جتنے بھی کھلاڑی ہیں، وہ کھلے عام اس کے اندر نظر آرہے ہیں۔ اب فوج بھی سارے بحران کے حصے کے طور پر عوام کے سامنے ہے۔ پراپیگنڈے کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے، تو جو بھی نتیجہ نکلے گا، اس میں اب فوج برابر کی شریک نظر آئے گی۔ اگر فوج فسیلیٹیٹر کی بجائے گائنز کے طور پر سامنے آتی ہے، تو جمہوری قوتوں کا وہ نقصان نہیں ہوگا، جو کریٹیکل ماس کو نظر آرہا ہے۔ بلکہ فوج اور مارچ دھرنا قوتیں باہم کھیل کھیلتی نظر آئیں گی۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ہوگا، کہ جمہوریت مخالف قوتوں اور پارلیمنٹ کے درمیان تنازعے میں فوج کو غیر جانبدار کردار ادا کرنے کو کہا گیا ہو، لیکن وہ پارلیمنٹ مخالف قوت کے طور پر سامنے آجائے۔ اور حاشیہ برادر سیاسی قوتیں اس کے دم چھلہ بریگیڈ کے طور پر فاش ہو جائیں۔ کیا فوج ایسا ہونے دے گی، کہ سارا قصور اسی کا سامنے آئے؟ یہ دیکھنے کی بات ہے۔

مصنف نے اپنے ۳۵ سالہ صحافیانہ کیریئر کے دوران کاؤنٹر ٹیررازم ٹیکس رپورٹنگ اور دیگر اقتصادی و سیاسی موضوعات پر کام کیا۔
اس میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

قبائلی خواتین: چادر اور چار دیواری سے سڑکوں پر

الہام کاکڑ

پچھلے کئی سالوں سے حکومت پاکستان کو تنازعات سے متاثرہ علاقوں کے بے گھر افراد کی مدد کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑھ رہا ہے۔ایک طرف تو شمالی وزیرستان کے لوگوں کو بہت ہی کم وقت میں اپنے گھروں کو چھوڑنا تھا اور دوسری جانب حکومت کی طرف سے کوئی انتظامات نہیں کیے گئے تھے۔حکومت نے قبائلیوں کو ٹرانسپورٹ فراہم کرنے کی سہولت کا وعدہ پورا نہیں کیا۔جس کے باعث ایک بڑی تعداد میں مرد،عورتوں اور بچوں کو اپنے سامان کے ساتھ طویل فاصلے پیدل طے کرنا پڑے۔

شمالی وزیرستان کی خواتین ایک ایسی ثقافت سے تعلق رکھتی ہیں جہاں مرد کی بات ہی سنی جاتی ہے۔پختون ولی زندگی گزارنے کا ضابطہ اخلاق ہے، جہاں خواتین کی ساری ذمہ داری مردوں کو سونپی جاتی ہے اس لیے یہ خواتین اپنے گھر کی چار دیواری تک محدود رہتی ہیں اور گھریلو سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔وہ اپنی زندگی کے ہر مرحلے پر خاندان کے مرد اراکین پر انحصار کرتی ہیں۔ان خواتین کی نقل وحرکت محدود ہوتی ہے اور ان کو پردا کرنے کا پابند بنایا جاتا ہے۔ان علاقوں میں عسکریت پسندوں کی مداخلت کے بعد خواتین کے حالات بدتر ہوتے چلے گئے۔ان علاقوں میں حکومت کی غفلت کی وجہ سے جو ہسپتال اور سکول پہلے ہی سے بہت بری حالت میں تھے ان کو عسکریت پسندوں نے تباہ کر دیا۔ان عسکریت پسند تنظیموں نے قبائلی معاشرے کی روزمرہ کی سرگرمیوں میں خلل پیدا کیا ہے۔

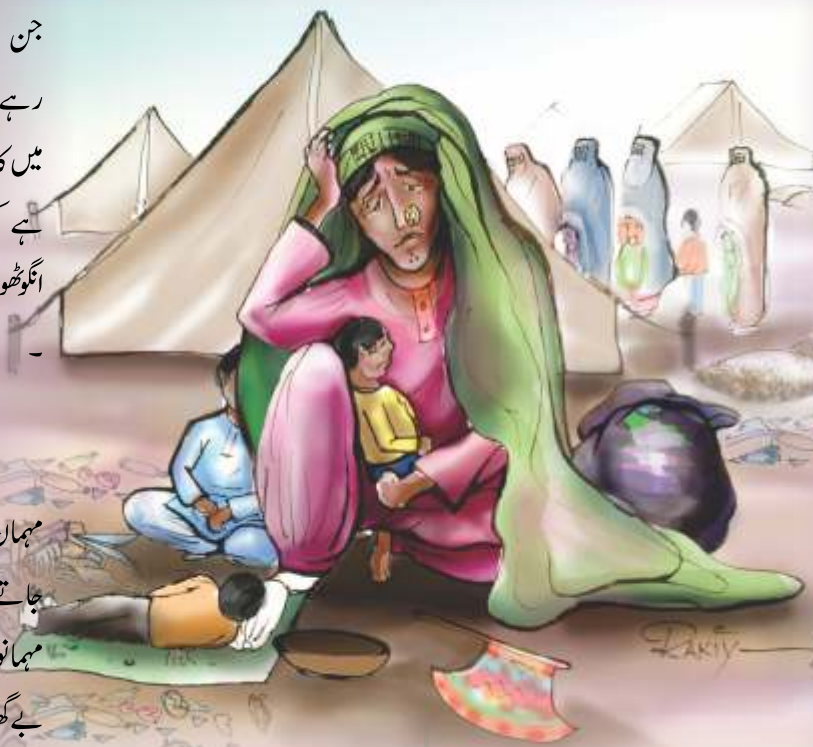

کیمپوں میں آباد عورتوں اور بچوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔فاٹا کی ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے مطابق شمالی وزیرستان سے بے گھر افراد کی تعداد ۸۸۸،۷۸۷ ہے جس میں سے ۲۱۱،۵۴۹ مرد ہیں ۲۳۶،۸۸۳ خواتین اور ۳۳۹،۴۵۶ بچے ہیں۔شمالی وزیرستان سے بے گھر خواتین کو کیمپ میں سب سے پہلے جس مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہے مالی امداد کی وصولی کے لیے اندراج کا طریقے کار ہے۔بیوہ عورتوں کو اپنے خاندان کا اندراج کروانے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان لوگوں کے شناختی کارڈ یا نکاح نامے دستیاب نہیں ہوتے۔خواتین جن کے شوہر بیرون ملک کام کر رہے ہیں ان کو بھی اندراج کروانے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کو اپنے شوہر کے انگوٹھوں کی نشاندہی کروانی ہوتی ہے۔

قبائلی علاقے کے لوگ اپنی مہمان نوازی کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ان کے حجرے کبھی بھی مہمانوں کے لیے بند نہیں ہوتے۔بے گھر ہونے سے ان لوگوں کو کافی دھچکا لگا ہے جس کی وجہ سے ان کی خود اعتمادی بھی متاثر ہوئی ہے۔بنو پریس کلب میں وزیرستان قومی کمیٹی کے ارکان نے اپنی پریس کانفرنس میں اشارہ دیا کہ جن لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے دوسروں کے لیے کبھی بند نہیں کیے ان لوگوں کو اب کھانا لینے کے لیے لمبی قطاروں میں کافی دیر تک انتظار کرنا پڑتا ہے اور یہ کھانا ان کے خاندان کے لیے ناکافی ہے۔یہ مرد اپنے بیوی اور بچوں کے لیے بنیادی سہولتیں فراہم نہیں کر پا رہے۔

شمالی وزیرستان سے بے گھر ہونے والی خواتین کو ان کیمپوں میں صنفی بنیاد پر تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وزیرستان میں ایک سے زائد شادیاں کرنا معمول کی بات ہے۔ کافی خواتین کو مالی امداد وصول کرنے میں مشکلات کا سامنا اس لیے کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کے شوہر نے ایک ہی خاندان کا اندراج کروایا ہوا ہے۔ بے گھر افراد کے لیے کیمپوں میں جو انتظامات کیے گئے ہیں وہ قبائلی علاقوں کی ثقافت اور پردے کی روایات کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ان کیمپوں میں خواتین رضا کاروں کی کمی ہے جن کی وجہ سے بے گھر خواتین کو مرد رضا کاروں سے بات چیت کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان بے گھر خواتین نے شکایت کی ہے کہ یہ رضا کار ان کے ساتھ سخت رویہ اپناتے ہیں اور ان کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں۔ کچھ بے گھر افراد کا کہنا ہے کے انھوں نے جن لوگوں کے گھر پناہ لی ہوئی ہے وہ لوگ ان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنی بیٹیوں کی شادی ان کے خاندانوں میں کرائی جائیں۔

شناختی دستاویزات نہ ہونے کی وجہ سے شمالی وزیرستان سے بے گھر ہونے والی خواتین کو مالی امداد نہیں ملتی۔ جو خواتین اپنے شناختی دستاویزات پیش نہیں کر سکتی ان کو اندراج کرنے سے پہلے نادرا کا ٹوکن حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کئی خواتین نے ٹوکن گما دیا ہے اور ان کو نئے ٹوکن حاصل کرنے کے عمل کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ کچھ خواتین کو موبائل فون استعمال کرنا نہیں آتا جس کی وجہ سے ان کو مالی امداد حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے جو سروس پوائنٹس بنائے ہیں وہ کافی دور ہیں اور خواتین مسافروں کے کرائے میں اضافے کی وجہ سے ادھر نہیں جا سکتی۔

شمالی وزیرستان سے جو بچے بے گھر ہوئے ہیں ان کی تعلیم کافی متاثر ہوئی ہے کیونکہ ان کیمپوں میں تعلیم کی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ سکولوں کی کمی کی وجہ سے جو بچے بے گھر ہوئے ہیں وہ گلیوں میں بھیک مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان بچوں کے بھیک مانگنے کی ایک وجہ ان کے خاندانوں کو ملنے والی امداد ہے جو ان کے لیے ناکافی ہے۔

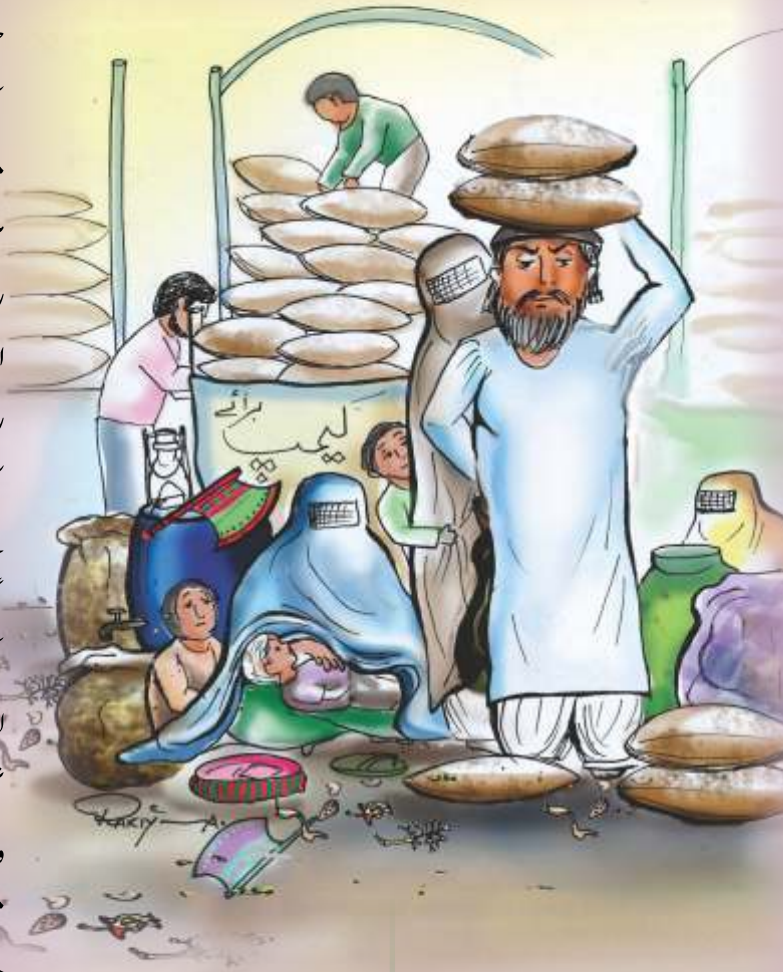

وہ خاندان جن کو اپنے گھر چھوڑنے پڑے وہ سرکاری سکولوں کی عمارتوں اور کیمپوں میں غیر مناسب حالات میں رہنے پر مجبور ہیں۔ زیادہ تر بے گھر افراد اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رہ رہے ہیں اور سکولوں میں چھوٹے کمروں میں رہنے پر مجبور ہیں جس کی وجہ سے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان بے گھر افراد کو تاریخ دی گئی ہے کہ سکولوں کو خالی کریں اور کہیں اور منتقل ہو جائیں لیکن یہ لوگ سکولوں سے منتقل ہونے کو تیار نہیں کیونکہ کرائے میں اضافے کی وجہ سے ان کو گھر کرائے پر لینا مشکل ہے۔ ان بچوں اور خواتین کو جو کپڑے دیے جاتے ہیں وہ ان جگہوں کے موسم کے مطابق مناسب نہیں ہوتے۔ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ بے گھر خواتین نے مقامی گھروں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے جب کہ مرد حضرات بیکار بیٹھے ہیں اور کام نہ ہونے کی شکایت کرتے ہیں۔

یہ قبائلی خواتین صحت کی سہولیات حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں اور ان کیمپوں میں رہنے کے دوران سنگین صحت کے مسائل کا سامانا کرنا پڑ رہا ہے ۔ان کیمپوں میں جو صحت کی سہولیات دستیاب ہیں وہ ناکافی ہیں کیونکہ ان سے خواتین کے مسائل حل نہیں ہو رہے ۔ بنیادی صحت کے مراکز (بی ایچ یو) مناسب طریقے سے کام نہیں کر رہے اور جو ادویات فراہم کی جاتی ہیں وہ نا مناسب ہیں ۔بے گھر خواتین کی دیکھ بھال کے لیے کیمپوں میں لیڈی ہیلتھ ورکرز کا موجود ہونا ضروری ہے ۔ڈاکٹروں کو ان خواتین کی تولیدی صحت پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ان بے گھر افراد میں جو حاملہ خواتین ہیں ان پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ پینے کے صاف پانی کی فراہمی کے مسئلے پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔کچھ بے گھر خواتین پینے کے لیے پانی قریبی گھروں سے لاتی ہیں جب کہ باقی خواتین نہر اور دریا کا پانی پینے پر مجبور ہیں۔

ان بے گھر خواتین کو نا صرف بنیادی ضروریات کی کمی اور بنیادی ڈھانچے کے نقصان کا سامنا کرنا پڑا بلکہ نفسیاتی اثرات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ یہ خواتین عسکریت پسندوں کے خطرے سے اور خاندان کے اراکین کے کھونے کے ڈر سے پہلے ہی خوف میں مبتلا ہیں۔ بہت سے بے گھر افراد نفسیاتی مسائل کا شکار ہیں جیسے غصے میں آجانا، نیند کی کمی، کھانا نہیں کھانا، سر میں درد ہونا، روزمرہ کی سرگرمیوں میں دلچسپی نہیں لینا اور عدم تحفظ کا شکار ہونا۔ان لوگوں کے نفسیاتی امداد مہیہ نہیں ہے۔

نوجوان خواتین رکن قومی اسمبلی عائشہ گلالئی وزیر اور فوزیہ قصوری اکثر ان بے گھر افراد کے پاس جاتی ہیں اور ان پریشان خواتین سے ملاقات کرتی ہیں ۔حکومت کو طبی امداد، تولیدی صحت کی دیکھ بھال، غذائی راشن اور پینے کے صاف پانی کو بے گھر افراد کے خاندان کے سائز کے مطابق فراہم کرنا ضروری ہے تاکہ ان کو کسی قسم کی کمی کا احساس نا ہو۔ہمیں ان لوگوں کے لیے قربانی دینا ہوگی کیونکہ ان لوگوں نے ہمارے لیے قربانی دی ہے اور اپنا گھر بار چھوڑ کر کھلے آسمان تلے بیٹھے ہیں۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں کمیونیکیشن آفیسر کی حیثیت سے
کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

انتباہ: یہ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے

ذوالفقار حیدر

آجکل واقعی ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کا زمانہ ہے۔ کیا معلوم کب اور کیسے آپ کی کوئی ویڈیو یا تصویر سوشل میڈیا پر آجائے اور پھر کیا، اگر تو آپ نے کوئی اچھا کام کیا ہے تو بچ جائیں گے، نہیں تو آپ کی خیر نہیں۔ ہاں البتہ یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ سوشل میڈیا پر شیئر کی جانے والی بہت سی معلومات کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا اور اسے پھیلانے کا ایک مقصد انتشار پھیلانا ہوتا ہے۔ ہم سب سوشل میڈیا کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ سمارٹ فونز کے ایجاد نے سوشل میڈیا کو لوگوں کی پہنچ میں لانے میں ایک بڑا کردار ادا کیا ہے۔ سٹیزن جرنلزم ایک ایسے شعبے کی صورت میں سامنے آیا ہے جس نے صحیح معنوں میں فری میڈیا کا تصور شہریوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ اگر آپ کہیں بھی کوئی ناانصافی ہوتے ہوئے دیکھیں یا کوئی ایسا واقع رونما ہوتے ہوئے دیکھیں جو شہریوں یا انتظامیہ کی توجہ کا طلب گار ہو، اور آپ کے پاس ایک کیمرا موجود ہو تو فوراً اُس واقعے کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرلیں اور پھر کسی بھی سوشل میڈیا ویب سائٹ پر اُس کی تشہیر کر کے لوگوں اور انتظامیہ تک اپنا پیغام پہنچائیں۔

آجکل پاکستان کا ہر میڈیا چینل اور اخبار اپنی پوری توجہ اسلام آباد میں ہونے والے دھرنوں پر مرکوز کیے ہوئے ہے اور ہم میں سے ہر کوئی اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر اِن دھرنوں میں شرکت کرنے والوں کی کھینچی ہوئی تصاویر اور ویڈیوز دیکھتے رہتے ہیں۔ یقیناً یہ میڈیا کسی بھی روایتی میڈیا سے تیز ہے، اور فوراً ہی ایک پیغام کو لاکھوں لوگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ فیس بک تو ویسے بھی ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے کیونکہ مصر اور دیگر عرب ممالک میں آنے والے انقلاب اسی پلیٹ فارم کی وجہ سے ممکن ہو پائے تھے۔ نا صرف یہ بلکہ پاکستانی سیاست میں فیس بک اور ٹوئٹر کا بڑھتا ہوا استعمال بھی اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے۔ چاہے کوئی سیاستدان ہو، سوشل ورکر ہو یا کوئی فنکار، تمام حلقے سوشل میڈیا کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔ سیاسی جماعتیں جہاں اپنے سیاسی منشور کی تشہیر کیلئے روایتی طریقے استعمال کرتی ہیں وہیں سوشل میڈیا استعمال کرنے والوں تک اپنا پیغام پہنچانے کیلئے نئے میڈیا کا استعمال بھی بھرپور طریقے سے کیا جا رہا ہے۔ البتہ یہ یاد رہے کہ چونکہ سوشل میڈیا ایک فری میڈیا ہے اِس لئے اِس پر شیئر کی جانے والی بہت سی معلومات غلط بھی ہوسکتی ہیں۔

جیسا کہ اسلام آباد میں دھرنا دینے والی ایک جماعت کے سوشل میڈیا ونگ کی جانب سے چند تصاویر شیئر کی گئیں۔ تصاویر دیکھ کر کچھ شک ہوا کہ یہ تصاویر اسلام آباد کی نہیں ہیں۔ میرا شک یقین میں اُس وقت تبدیل ہوا جب مجھے ایک مشہور ہفتہ وار انگریزی اخبار کی ویب سائٹ پر ایک تجزیہ پڑھنے کا موقع ملا جس میں اسی موضوع پر بات کی جا رہی تھی۔ وہ تصاویر واقعی مصر، وینزویلا، شام اور کوئٹہ میں ہونے والے واقعات سے لی گئیں تھیں۔ کیونکہ اگست کے مہینے میں اسلام آباد میں سویٹر پہننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ جاننے کے بعد مجھے جہاں دلی افسوس ہوا وہیں یہ احساس بھی ہوا کہ کوئی کتنی ہی انصاف کی بات کرتا ہو وہ اپنے فائدے کیلئے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اِس جماعت کے سوشل میڈیا ونگ نے ایسا قدم اٹھایا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انٹرنیٹ ہو یا کوئی اور میڈیا تنازعہ پیدا ہونے سے کسی بھی موضوع میں لوگوں کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور جتنی دلچسپی بڑھے گی اتنا ہی چینلز کی ریٹنگ بڑھے گی اور سوشل میڈیا ویب سائٹ پر لوگوں کی ٹریفک میں اضافہ ہوگا اور شاید اسی مقصد کے فروغ کیلئے بہت سا جھوٹ بھی سوشل میڈیا کی زینت بن جاتا ہے۔

جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا کہ آجکل ہر قدم پھونک پھونک کر چلنے کا زمانہ ہے اور اگر آپ نے غلطی سے کوئی ایسا کام کر دیا ہے تو آپ کا بچنا مشکل ہو جائے گا۔ ایسا ہی کچھ ایک سینیٹر اور ایک وفاقی وزیر کے ساتھ ہوا جنہیں کراچی سے اسلام آباد کی فلائٹ پکڑنی تھی۔ جہاز کے اسٹاف نے اِن صاحبان کے

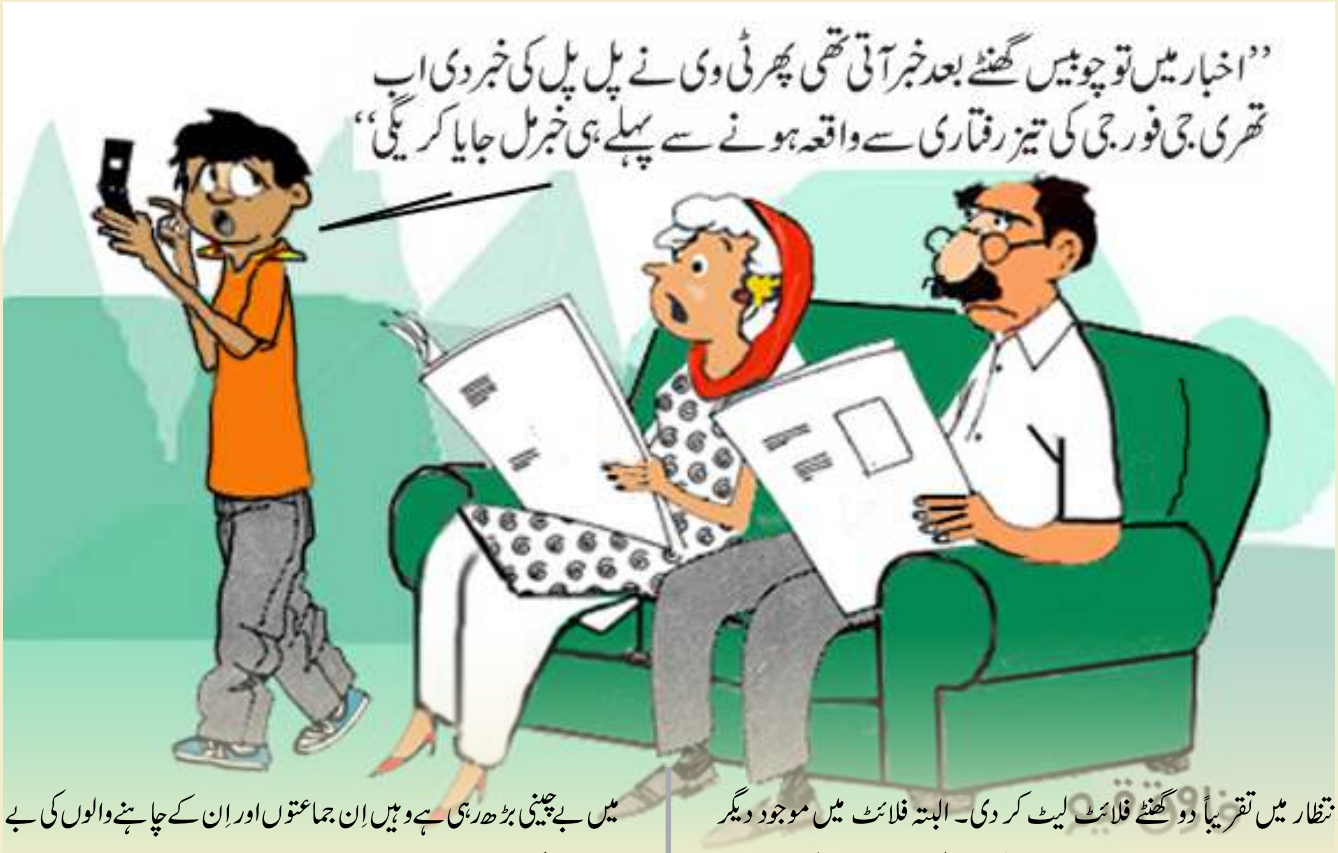

انتظار میں تقریباً دو گھنٹے فلائٹ لیٹ کر دی۔ البتہ فلائٹ میں موجود دیگر مسافروں نے نا صرف اپنا احتجاج ریکارڈ کروایا بلکہ ان صاحبان کو فلائٹ پر بیٹھنے سے روک دیا۔ اگلے ہی دن یہ ویڈیو پورے سوشل میڈیا پر آگ کی طرح پھیل گئی اور جنابِ سینیٹر اور وفاقی وزیر کو میڈیا کے سامنے صفائی پیش کرنا پڑی۔

اِس واقعے سے یہ ظاہر ہے کہ سوشل میڈیا ایک طاقتور میڈیا کے طور پر سامنے آرہا ہے جو اپنے ہر استعمال کرنے والے کو ایسی آزادی فراہم کرتا ہے جو کوئی اور میڈیا فراہم نہیں کرسکتا۔ البتہ اِس آزادی کے ساتھ ساتھ ذمہ داری کا احساس بھی بہت ضروری ہے تا کہ جھوٹ موٹ کی معلومات کی تشہیر سے کسی فرد یا شخصیت کی ساکھ کو نقصان نا پہنچے۔

اسلام آباد میں دھرنا دینے والی دونوں جماعتیں انقلاب برپا کرنے پچھلے ایک مہینے سے اسلام آباد میں موجود ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں لوگوں میں بے چینی بڑھ رہی ہے وہیں اِن جماعتوں اور اِن کے چاہنے والوں کی بے چینی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایسے اوچھے ہتھکنڈوں کے ذریعے عوام کو وہ جھوٹ دکھانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو شاید کسی اور کا سچ ہے۔ یقیناً جو بھی انقلاب ایسے جھوٹ پر مبنی ہوگا وہ کسی صورت بھی ایک حقیقی انقلاب نہیں بن سکتا۔

آخر میں ان جماعتوں کے سوشل میڈیا ونگز سے گزارش ہے کہ ایسے اقدام نا اٹھائے جائیں جن سے شہریوں کی امیدوں پر پانی پھر جائے۔ ان جلسوں میں شریک شہری اپنے مسائل کے حل کی خاطر ان جماعتوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ایسا نا ہو کہ ایک جھوٹ کی خاطر یہ جماعتیں ایسے لوگوں کا ساتھ کھو دیں جو واقعی حقیقی تبدیلی کے خواہشمند ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ سیاستدانوں کے لئے بھی انتباہ ہے کہ اب وہ شہریوں کو زیادہ دیر بیوقوف نہیں بنا سکتے کیونکہ یہ سوشل میڈیا کا زمانہ ہے۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں سینیئر پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

خواتین معاشرے کی ڈرائیونگ فورس

الہام کاکڑ

۱۹ اگست، ۲۰۱۴ء پاکستان کی تاریخ میں ایک اہم دن کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ اس دن اسلام آباد کو اندرونی طور پر بند کیا جا رہا تھا تاکہ انقلاب اور آزادی مارچ کی وجہ سے پیدا ہونے والے ممکنہ انتشار سے بچا جا سکے۔ اسی دن جب سیکورٹی اہلکار انقلاب اور آزادی مارچ کے حوالے سے احکامات موصول ہونے کا انتظار کر رہے تھے، ایک نیوز چینل نے ایک غیر معمولی خبر نشر کی۔

ایک خاتون خبر نگار نے طنزیہ انداز میں ایک خبر پیش کی کہ ایک خاتون تھانے دارنی بن کر سیکورٹی فرائض انجام دے رہی ہے، جبکہ وہاں موجود پولیس اہلکار بھی اسے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ ایک مرد صحافی نے ایک عورت کو متعارف کروایا جو پولیس افسر بنی ہوئی تھی۔ اس صحافی نے دو بار اس عورت کو لیڈی پولیس کانسٹیبل کہا اور اس سے حفاظتی اقدامات کے بارے میں دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس عورت نے عام سے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ہاتھ میں ڈنڈا پکڑ رکھا تھا، پنجاب پولیس کی ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور کندھے پر پنجاب پولیس اور پاکستانی پرچم کے بیج لگائے ہوئے تھے۔ اس خاتون کا کہنا تھا کہ وہ پوری طرح تیار ہے دھرنے کے شرکاء کو ڈنڈے سے قابو کر سکتی ہے۔ وہ خاتون کافی اطمینان کے ساتھ بات چیت کر رہی

تھی اور اُس نے پولیس محکمہ کا حصہ بننے میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک عام شہری ہے۔ جب ان سے مارچ کے شرکاء کو قابو کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ وہ ان شرکاء کو ڈنڈے سے قابو کر سکتی ہیں اور یہ ڈنڈا صحافی پر بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ یہ خبر ٹیلی ویژن ناظرین کے لیے ہی نہیں بلکہ اُن مرد حضرات اور پولیس افسران کے لیے بھی مزاح کا باعث بنی رہی جو اس جگہ پر موجود تھے۔

اس خبر میں صحافی نے مرد پولیس اہلکاروں کو پولیس اہلکار کہا جبکہ خاتون پولیس اہلکار جو مرد پولیس اہلکار جیسے فرائض انجام دیتی ہیں انہیں میڈیا میں مختلف طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ جب ایک خاتون پولیس اہلکار کسی ڈیوٹی پر معمور ہو تو زیادہ توجہ اس بات پر دی جاتی ہے کہ وہ کوئی کام کر رہی ہے اور اُسے پولیس اہلکار کی بجائے لیڈی پولیس کانسٹیبل کے نام سے پکارا جاتا ہے جبکہ ایک مرد پولیس اہلکار کو صرف پولیس اہلکار کہا جاتا ہے۔ زبان کے اِس منتخب استعمال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محکمہ پولیس میں بھی خواتین کے کردار کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

خبر کے آغاز میں ہی خواتین پولیس کو ایک منفی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ایک خاتون پولیس اہلکار کے روپ میں ہے جس نے غیر مناسب رویہ اپنایا ہوا ہے اور اچھی گفتگو بھی نہیں کر رہی ہے۔ اس خاتون نے مکمل طور پر پولیس کی وردی زیب تن نہیں کی ہوئی ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ خواتین پولیس اہلکار پر کوئی پابندی نہیں ہے اور انڈو ویجوئل لینڈ نے بھی اپنے سرویز میں یہ دیکھا ہے کہ کچھ خواتین پولیس اہلکار ڈیوٹی کے وقت مکمل وردی میں نہیں ہوتیں، لیکن کچھ خواتین اہلکار باقاعدہ وردی کا خیال رکھتی ہیں اور نظم و ضبط کا خیال رکھتی ہیں۔

خبر کے اختتام پر یہ خاتون ظاہر کرتی ہے کے وہ ایک عام شہری ہے اور محکمہ پولیس میں شمولیت میں دلچسپی رکھتی ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اب بدلتے ہوئے صنفی کرداروں کو تسلیم کیا جانے لگا ہے اور خواتین اب مختلف شعبوں میں جانے کا شوق رکھتی ہیں اور دقیانوسی تصورات کو تبدیل کرنے لگی ہیں۔اس خبر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خاتون محکمہ پولیس میں جانے کے لیے پُر جوش ہے۔انڈوبیجوئل لینڈ کی ریسرچ بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ خواتین کے پولیس میں جانے کے شوق اور مواقع موجود ہونے کے باوجود ہمارا معاشرہ خواتین کو پولیس میں جانے سے روکتا ہے۔

انڈوبیجوئل لینڈ کی رپورٹ پاکستان کی پولیس سروسز میں خواتین کی 1% نمائندگی کو نظر انداز کر رہی ہے۔ایک طرف تو محکمہ پولیس میں خواتین کی اِس قدر کم تعداد اِن کے محکمہ پولیس میں نہ ہونے کے برابر کردار کی بھی منظر کشی کرتی ہے اور دوسری طرف میڈیا بھی خواتین پولیس کی مثبت تصویر پیش کرنے میں ناکام رہا ہے۔اس طرح کی خبریں خواتین پولیس کی بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔ضرورت اِس امر کی ہے کہ خواتین پولیس کے بارے میں ایسے

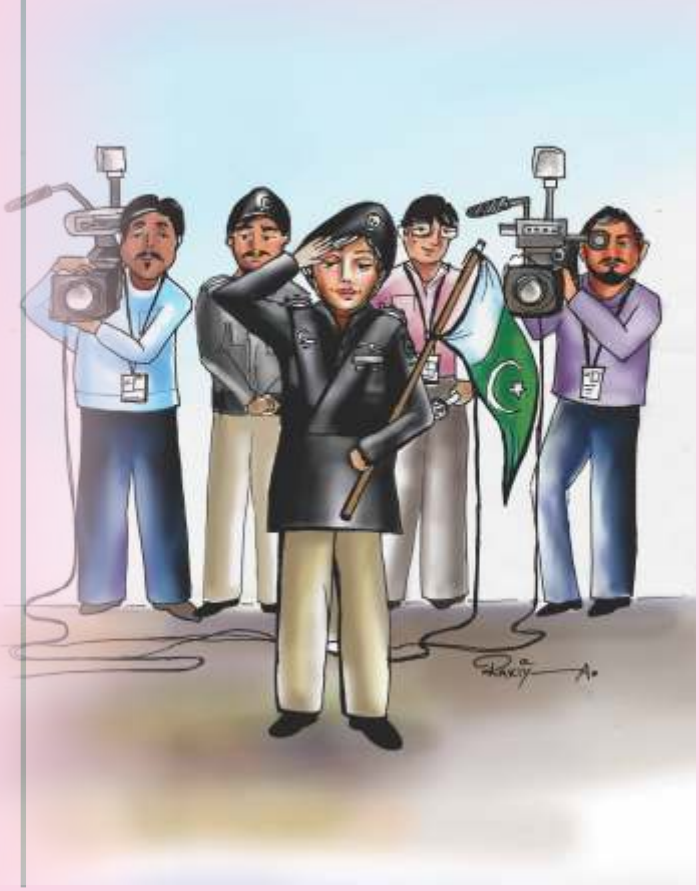

خیالات کو نا صرف سماج بلکہ اداروں کی سطح پر بھی تبدیل کیا جائے۔خواتین

پولیس کو اس رنگ میں پیش کرنے سے نا صرف مردوں کے متعصب رویے مضبوط ہوتے ہیں بلکہ خواتین بھی اسی سوچ کو اپنا لیتی ہیں۔اس سے اُن دقیانوسی اور منفی رجحانات کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے کہ پولیس میں موجود خواتین بھی نامناسب رویہ اپنا لیتی ہیں اور طاقت کا استعمال کرتی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی خبریں کیوں بنائی جاتی ہیں؟ میڈیا ایسی خبر نشر کر کے خواتین پولیس کے بارے میں غلط تاثر دے رہا ہے۔خواتین پولیس کو نا صرف ادارے کی سطح پر بلکہ سماجی سطح پر بھی مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔میڈیا کو بھی اپنے کردار کو بہتر بنانے پر زور دینا ہوگا۔میڈیا خواتین پولیس کی کامیابیوں کو اجاگر کرنے میں اپنا اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔اس سے نا صرف ہمارے معاشرے میں خواتین پولیس کے بارے میں موجود غلط فہمیوں کا خاتمہ ہوگا بلکہ اِن کے بارے میں ایک مثبت رائے قائم ہوگی۔اس طرح میڈیا خواتین پولیس کی مثبت تصویر پیش کر کے دوسری خواتین کی حوصلہ افزائی کرے گا اور ان میں بھی پولیس میں جانے کا شوق پیدا ہوگا۔

یہ خبر امن وامان کی صورتحال کی ناکامی کے بارے میں بھی منفی تاثر دیتی ہے۔ان اہم حالات میں پولیس حکام کو سیکورٹی کے لیے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ایک خاتون اپنے آپ کو پولیس کانسٹیبل کہہ رہی ہے جس سے خواتین پولیس اہلکار بدنام ہو رہی ہیں اور اس سے حفاظتی اقدامات میں کمزوریاں بھی ظاہر ہو رہی ہیں۔پولیس اہلکاروں نے اس خاتون کو پولیس اہلکار کی نقل کرنے سے نہیں روکا۔خواتین معاشرے میں کمزور سمجھی جاتی ہیں۔اگر ایسی حرکت کسی مرد نے کی ہوتی تو اس کو دہشت گرد قرار دیا جاتا اور خبر ہر نیوز چینل پر نشر ہوئی ہوتی۔لیکن یہاں ایک عورت نے یہ حرکت کی جس کی وجہ سے اس خبر کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا۔

موجودہ صورتحال میں خواتین کو مستند عہدے حاصل کرنے اور اپنا زورِ بازو دکھانے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔اس خبر میں دکھائی جانے والی خاتون

پولیس اہلکار ایسے ادارے میں صنفی اختیارات کی نمائندگی کر رہی ہے جہاں ہمیشہ سے مردوں کا غلبہ رہا ہے ۔ پولیس یونیفارم میں ملبوس ہونے سے جیسے اِس خاتون میں ایک نئی ہمت آ گئی ہے اور وہ مرد صحافی کے سامنے آرام سے گفتگو کر رہی ہے ۔ وہ ڈنڈے کے استعمال پر زور دیتی ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کے یہ خاتون محکمہ پولیس میں موجود ذہنیت پر یقین رکھتی ہے ۔ اُسے یہ احساس ہے کہ پولیس کا حصہ ہونا طاقت کا سرچشمہ ہے ۔ وہ سمجھتی ہے کہ ڈنڈے سے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں ۔ اس طرح کی سوچ رکھنے سے یہ سمجھ آتی ہے کے وہ مسائل کو تشدد کے ذریعے حل کرنے پر یقین رکھتی ہے ۔ وہ طاقت کو پولیس کی وردی سے منسلک کر رہی ہے اور اس طاقت کو کمزور سمجھ رہی جو وہ ایک ذمہ دار شہری اور خاتون کے روپ میں استعمال کر سکتی ہے ۔ خواتین کے لیے کہ ان کو اپنی صلاحیت کا ادراک ہو اور جو مواقع ان کو فراہم کیے جائیں ان سے وہ پورا فائدہ اٹھائیں ۔

میڈیا کا ایسی خبر نشر کرنا قابل بحث ہے ۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میڈیا ایسی خبر نشر کرنے سے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہا ہے؟ یا سامعین ایسی خبر نشر کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ کیا میڈیا کو یہ زیب دیتا ہے کے وہ خواتین پولیس کا تمسخر اُڑائیں؟ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ ایسی خبر پر ہنسیں یا پھر اس کی تنقید کریں ۔

مصنفہ انڈویجوئل لینڈ پاکستان میں کمیونیکیشن آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں ۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

سیاست اور نوجوان

سندس سیدہ

کسی بھی ملک کے نوجوان اس کا قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں، اور اس کی ترقی کا انحصار نوجوانوں کی صلاحیتوں اور نوجوان قیادت پر ہوتا ہے۔ آج کل حالات ایسے ہیں کہ اگر کوئی نوجوان پڑھ لکھ جائے اور اسکو نوکری نہ ملے تو اس کے گھر والے اور وہ خود اس کی ذمہ داری حکومت کو دیتا ہے اور یہ کسی حد تک سچ بھی ہے۔ جب ایک نوجوان کو اس کی نوکری کے ٹیسٹ اور انٹرویو میں منتخب ہونے کے باوجود ایک فون کال موصول ہو اور نوکری کے لیے ۴ لاکھ روپے رشوت کے طور پر طلب کیے جائیں تو اِس کا آخر اور کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ ایک عام نوجوان جو نوکریوں کے لیے دھکے کھاتا ہے وہ بھلا اتنی بڑی رقم کیسے دے سکتا ہے؟ کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک سرکاری ادارے کی نوکری سرکاری ہیرا پھیری سے پاک ہے؟ صرف یہ ہی نہیں اس نوکری ملنے اور نہ ملنے کے عمل میں سیاست کا عمل دخل اتنا ہے کہ اس نوجوان سے پوچھے گئے سوالوں میں یہ پوچھا جارہا ہے کہ وہ نوجوان جس نے انٹرویو دیا ہے وہ کس علاقے کا ہے؟ وہاں سے حکومتی پارٹی کے کون سے امیدوار کھڑے ہوتے ہیں اور وہ کس کو ووٹ دیتا ہے ؟ میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کیا یہ سیاسی بھرتیاں نہیں؟ اور کیا یہ سیاسی نظامِ جمہوریت نہیں ہے؟

صرف یہ ہی ایک مثال نہیں بلکہ انڈوبجوئل لینڈ کا خواتین پولیس سے متعلق جتنا بھی کام رہا اس سلسلے میں پولیس اہلکار اور افسران سے بات چیت کے مواقع میسر آئے۔ سیاسی مداخلت کے حوالے سے سب سے اہم چیز جو سامنے آئی وہ یہ تھی نا صرف ترقی اور تبادلہ سیاسی طور پر ہوتا ہے بلکہ سیاسی بھرتیاں بھی کی جاتی ہیں، جس کی وجہ سے پہلے سے موجود اہلکاروں کی وقت پر ترقی نہیں کی جاتی اور ان کی جگہ نئے لوگوں کو بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ دوسری چیز یہ تھی کہ پنجاب پولیس میں بھرتیاں کرنا ایک سیاسی جماعت کا کام ہے جس کے نتیجے میں وہ عوام کے ملازم نہیں صرف سیاسی ملازم بن کر رہ جاتے ہیں اور ان ہی کے پروٹوکول اور ان ہی کی حفاظت پر معمور رہتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو جان کر میں جس نتیجے پر پہنچی وہ یہ تھا کہ ہمارے ملک میں سیاست کا بہت عمل دخل ہے اور سیاسی پارٹیاں ہر محکمے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے سیاسی بھرتیوں کا سہارا لیتی ہیں۔ ایسی صورتحال میں ہم اور ہماری نوجوان نسل کیسے غیر سیاسی رہ سکتے ہیں؟ جہاں نظامِ تعلیم سے لے کر روزی روٹی کا انحصار تک سیاسی بنیادوں پر ہوتا ہو۔ جہاں حفاضتی فرائض دینے والے لوگ بھی سیاسی پسِ منظر سامنے رکھتے ہوئے اپنے فرائض انجام دیں۔ نوجوانوں کی سیاست میں دلچسپی کی بھی یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر کام سیاسی بنیادوں پر ہوتا ہے۔

اگر روزمرہ کے واقعات کو دیکھا جائے اور سیاسی لیڈروں کی گفتگو سنی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اپنے اپنے مفاد کے لیے کام کر رہی ہیں قوم و ملک کی ترقی اور بقا کی کسی کو کوئی فکر نہیں ہر پارٹی دوسری پارٹی کے لیڈروں کے نکتے ادھیڑنے میں مصروف نظر آتی ہے۔ بجائے اس کے کہ سیاسی لیڈر دوسرے لیڈروں کو نیچا دیکھانے کی کوشش کریں ان کو اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ ان کی اپنی پارٹی کے خلاف کتنی شکایات درج ہوئیں اور کہاں کہاں مظاہرے کیے گئے اور پھر انہوں نے اس میں سے کتنی شکایات کا ازالہ کیا۔

اگر ہم سیاست میں نوجوانوں کے کردار کی بات کریں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سیاسی پارٹی کی کامیابی کا دارومدار اسکے نوجوان سیاسی کارکنوں پر ہوتا ہے جن کو وہ اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور مقصد پورا ہو جانے کے بعد تمام ثبوت مٹا دیے جاتے ہیں۔ بلاشبہ سیاسی پارٹیوں کی بقاء کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ایسے نوجوان ہوں جو صرف ان کے لیے کام کریں پڑھے لکھے افراد آخر کتنا وقت سیاست کی نظر کر سکتے ہیں؟ اگر کر بھی سکتے ہیں تو اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ کسی ایک خاص حد تک کسی پارٹی کے فروغ کے لیے کام کر سکتے ہیں۔ یہاں ایسے لوگ کام آتے ہیں جو کسی بھی پارٹی کی اندھی تقلید کرنے والے ہوتے ہیں۔

بلا شبہ کسی سیاسی جماعت کا ساتھ دینے کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں ۔ یہ آرٹیکل لکھتے ہوئے میں نے اپنے کولیگز سے جب یہ سوال کیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کو ووٹ کیوں دیتے ہیں تو ان کے جوابات یکسر مختلف تھے۔ کسی کا کہنا تھا کہ وہ سیاسی منشور کو اور پالیسیوں کو دیکھتے ہوئے ووٹ دیتے ہیں۔ کسی نے کہا سیاسی جماعتیں جو وعدے کرتی ہیں ان سے امیدیں ہوتی ہیں کہ وہ ان وعدوں کو پورا کریں گی اس لیے ان کو ووٹ دیتے ہیں۔ ایک کولیگ کے خیال میں کہ ووٹ ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ کسی نا کسی کو ووٹ دے دیا جائے پھر بس جس کو ووٹ دینے کو دل کرتا ہے دے دیتا ہوں اسی کے ساتھ بیٹھے میرے کولیگ نے کہا میں ووٹ نہیں دیتا ناہی مجھے ان پارٹیوں پر اعتبار ہے ہر پارٹی کا اپنا مفاد ہوتا ہے جس کے لیے یہ کام کرتی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ بندہ ووٹ نہ دے کر ضائع کرے بجائے اس کے کہ ان پر ووٹ ضائع کیا جائے۔ صرف یہ ہی نہیں آج تک ووٹ اس لیے بھی دیے جاتے ہیں کہ ہمارے خاندان والے ہمیشہ سے کسی پارٹی کو ووٹ دیتے آئے ہیں، اس سے جڑی یہ سوچ کہ جن سیاسی پارٹیوں کو ہم ووٹ دیتے ہیں وہ ہمارے کام کرواتی ہیں بعد میں اس سسٹم کی بنیاد ڈالتی ہیں جس کا ذکر میں نے آرٹیکل کے پہلے پیراگراف میں کیا ہے۔

ہماری سیاسی جماعتوں کو چاہیے جیسے ان کے مختلف یونیورسٹی کالجوں میں گروہ ہوتے ہیں ان گروہوں کی باقاعدہ کیریئر کونسلنگ کریں ۔ بے شک یہ سیاسی جماعتوں کے لیے مشکل کام نہیں ہے۔ اگر ہم ملک میں کام کرنے والی کالعدم جماعتوں کی بات کریں تو بے شمار کالعدم جماعتیں ایسی ہیں جو اس قدر منظّم ہیں کہ کالج یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کی باقاعدہ کیریئر کونسلنگ کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں نوجوانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ نوجوان نسل ہی ہے جس پر ہمارے ملک کی ترقی کا انحصار ہے ان کو تباہی سے بچانے کے لیے ان مین شعور اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ غلط تصورات کو فروغ کرنے والی جماعتوں سے دور رہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو روزگار کے حصول کی زیادہ فکر لاحق رہتی ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کو درست راہ دیکھائی جائے۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ جس میدان میں ہمیں نوجوانوں کی زیادہ ضرورت ہے وہاں ہم ان پر سرمایہ لگا کر ملک وقوم کی خدمت کے لیے تیار کر سکیں گے، صرف یہ ہی نہیں بلکہ ہمیں باہر سے انجینئر اور ڈاکٹروں کو بلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں اور فردرسالے کی ایڈیٹر بھی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

شہید صحافت: ارشاد مستوئی

ذوالفقار حیدر

ارشاد مستوئی کی شہادت نے ایک بار پھر یہ یاد دہانی کروا دی کہ پاکستان میں آزادیِ صحافت کی سب سے بڑی قیمت جان کی قربانی ہے۔ پاکستان میں ایک صحافی کا سب سے بڑا جرم سچ بولنا اور سچ کا ساتھ دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو صحافیوں کیلئے سب سے خطرناک ملک تصور کیا جاتا ہے۔ کمیٹی ٹو پروٹکٹ جرنلسٹس کے مطابق پاکستان میں ۱۹۹۲ء سے لے کر اب تک ستر سے زیادہ صحافی اپنی جانوں کا نظرانہ پیش کر چکے ہیں۔

جب پرویز مشرف نے میڈیا پر پابندیاں ختم کر کے نجی نیوز چینلز کو کام کرنے کی اجازت دی تو یہ سمجھا جانے لگا کہ اب صحافت صحیح معنوں میں آزاد ہو گئی ہے، مگر ایسا نا ہو سکا۔ اگرچہ اس اقدام سے صحافیوں کو ملازمت کے بہتر مواقع ضرور میسر آئے مگر آزادیِ صحافت پر قفل ڈالے جاتے رہے۔ نا صرف یہ بلکہ ہر اُس صحافی کو خاموش کروایا جاتا رہا جو سچ کو سچ ماننے اور اُس کی تشہیر پر یقین رکھتا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ ایک صحافی جائے تو جائے کہاں؟ وہ کتنا ہی غیر جانبدار ہو کر کام کر لے اُس سے کوئی نا کوئی ناراض ضرور ہو جاتا ہے۔

شاید ارشاد مستوئی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ارشاد ایک سچا صحافی تھا، جس نے ان تھک محنت سے صحافت میں اپنا نام پیدا کیا۔ وہ کوئٹہ میں آن لائن نیوز ایجنسی کے بیورو چیف اور اے آر وائی کے لئے اسائنمنٹ ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کر رہے تھے۔ اِس جان لیوا واقعے سے پہلے بھی ارشاد ایک خودکُش دھماکے کی زد میں آ کر اپنا ایک بازو گنوا بیٹھے تھے۔

ارشاد ایک خاموش طبع انسان تھے جس کی ساری توجہ اپنے پیشے پر رہتی تھی۔ ارشاد نا صرف قومی زبان میں صحافتی فرائض انجام دے رہے تھے بلکہ بلوچی اور براہوی زبانوں کے میڈیا پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ارشاد بلوچستان یونین آف جرنلسٹس کے سیکرٹری جرنل بھی تھے۔ ارشاد کی شہادت سے جہاں بلوچستان میں آزادیِ صحافت کا ایک اور چراغ گُل ہو گیا وہیں پاکستان بھر کی صحافت کو گہرا نقصان بھی ہوا۔

ارشاد مستوئی نے جہاں صحافتی خدمات جاری رکھیں وہیں بلوچستان میں صحافت کی تاریخ پر بھی تحقیق کرتے رہے۔ انہوں نے اسی سلسلے میں انڈیجینس لینڈ پاکستان کے لئے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ فریڈرک نومن

فاؤنڈیشن کے تعاون سے شائع کی جانے والی انڈوبجوئل لینڈ پاکستان کی اشاعت 'علاقائی صحافت: صارف کا نقطہ نظر' کے لئے ارشاد مستوئی نے 'بلوچستان میں بلوچی و براہوی صحافت کا مختصر جائزہ' کے عنوان سے ایک باب تحریر کیا جس میں انہوں نے بلوچی و براہوی زبانوں پر کی گئی تحقیق کو چند ہزار الفاظ میں سمونے کی کوشش کی۔ اس باب کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ارشاد مستوئی ایک سچے بلوچی تھے جو اپنی زبان، ثقافت اور علاقے کی بہتری کیلئے کوشاں تھے۔ انہوں نے جہاں بلوچی و براہوی صحافت کی تاریخ بیان کی ہے وہیں اِس کی بہتری کیلئے تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ اسی طرح انہوں نے فرد کے تیسرے شمارے میں بھی ایک باب تحریر کیا، جس میں انہوں نے بلوچستان میں آزادیِ صحافت کے رستے میں حائل مشکلات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی اور اِس کے ساتھ ساتھ صوبے کے سینئر صحافیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ نا صرف یہ بلکہ اس باب میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کے آزادیِ صحافت کے بارے میں خیالات بھی بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں بلوچستان میں شہید ہونے والے ۲۰ سے زائد صحافیوں کے مختصر تعارف بھی بیان کئے ہیں۔ افسوس کہ ارشاد مستوئی کا نام بھی اِن صحافیوں کی فہرست میں شامل ہوگیا ہے جو اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔

انڈوبجوئل لینڈ اور ارشاد مستوئی کا ساتھ صرف یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ فریڈرک نومن فاؤنڈیشن اور انڈوبجوئل لینڈ کے اشتراک سے منعقد کردہ دوسری قومی میڈیا کانفرنس کے ایک سیشن میں ارشاد مستوئی نے پینلسٹ کے طور پر شرکت کی اور اپنی گفتگو میں علاقائی زبانوں کے میڈیا خصوصاً بلوچی اور براہوی میڈیا کا احاطہ کرنے کی کوشش کی۔ غرضیکہ انڈوبجوئل لینڈ پاکستان کیلئے ارشاد مستوئی کی شہادت ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے جسے پورا کرنا ناممکن ہے۔

آزادیِ صحافت کے ثمرات سے مستفید ہونے والے تمام حلقوں کو اِس حقیقت سے روشناس کروانا ضروری ہے کہ یہ آزادی ارشاد مستوئی جیسے صحافیوں کی قربانی سے ممکن ہوئی ہے۔ البتہ اب بھی بہت سے علاقوں میں صحافت کو وہ آزادی حاصل نہیں جو دوسرے علاقوں کو حاصل ہے۔ اور شاید پاکستان میں صحافیوں کو حقیقی آزادی تب حاصل ہوگی جب انہیں اپنی نوکریوں کی فکر نہیں ہوگی اور وہ ہر ڈر، خوف یا لالچ سے بالاتر ہوکر اپنے فرائض انجام دیں گے۔ ایک صحافی اپنے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور تب تک صحافت آزاد نہیں ہوسکتی جب تک ہم میں ایک دوسرے کی بات سننے کا حوصلہ پیدا نہیں ہو جاتا۔ یقیناً جب ایسا ہو جائے گا تو ارشاد جیسے سچے لوگ کسی کی گولی کا نشانہ نہیں بنیں گے اور ہم ایک دوسرے کی رائے کو نا صرف سنیں گے بلکہ اُس کا احترام بھی کریں گے۔ میری دلی خواہش اور دعا ہے کہ ہم سب کو اپنی زندگیوں میں ایسا وقت دیکھنا نصیب ہو۔

مصنف انڈوبجوئل لینڈ پاکستان میں سینیئر پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

تصویری ریفرینس

۱

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Fracismandnationalconsciousnessnews.files.wordpress.com%2F2009%2F06%2Finternally-displaced-peoples-idp-pakistan-war-imperialism-terrorism-taliban-us1.jpg&imgrefurl=http%3A%2F%2Fwww.siasat.pk%2Fforum%2Fshowthread.php%3F237454-PPP-Closing-Border-for-IDPs-of-Operation-IDPs-Not-Allowed-in-Sindh&h=533&w=756&tbnid=QijOeVs1hHZSEM%3A&zoom=1&docid=i1x3D77FTxYMgM&ei=xx9GVO-WLIXcauKigtgJ&tbm=isch&ved=0CBwQMygBMAE&iact=rc&uact=3&dur=126&page=1&start=0&ndsp=15

۲

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Fcache.pakistantoday.com.pk%2F20140704153406-idps.jpg&imgrefurl=http%3A%2F%2Fwww.pakistantoday.com.pk%2F2014%2F07%2F19%2Fcity%2Fislamabad%2Frs-6-billion-released-so-far-for-idps%2F&h=220&w=480&tbnid=Ph8P1w6fStJ0hM%3A&zoom=1&docid=ZkP2keEeASFx7M&ei=xx9GVO-WLIXcauKigtgJ&tbm=isch&ved=0CB4QMygDMAM&iact=rc&uact=3&dur=154&page=1&start=0&ndsp=15

۳

Ref: http://defence.pk/threads/operation-zard-e-azb-updates-news-discussions.319265/page-97

۴

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Fwww.haitilibre.com%2Fimages-a%2Fg-12124.jpg&imgrefurl=http%3A%2F%2Fwww.haitilibre.com%2Farticle-12124-haiti-technologie-la-transition-vers-la-tv-numerique-pourrait-couter-30-millions-de-dollars.html&h=200&w=267&tbnid=j4e-Ywn7GuQj-M%3A&zoom=1&docid=l0qE3t6fUN8o1M&ei=fXU-VLe1A5fUasSjguAD&tbm=isch&ved=0CBsQMygAMAA&iact=rc&uact=3&dur=1&page=1&start=0&ndsp=15

۵

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Fwww.dailytimes.com.pk%2Fdigital_images%2F456%2F2014-09-09%2Fchronology-of-worst-floods-in-pakistan-1410280750-9803.jpg&imgrefurl=http%3A%2F%2Fwww.dailytimes.com.pk%2Fnational%2F09-Sep-2014%2Fchronology-of-worst-floods-in-pakistan&h=241&w=456&tbnid=xlerRnUz8Qbq9M%3A&zoom=1&docid=9ocqL0inRWnQZM&ei=3Wc-VJjRBsblaM3wgvAJ&tbm=isch&ved=0CBsQMygAMAA&iact=rc&uact=3&dur=282&page=1&start=0&ndsp=2

۶

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Ff.i.uol.com.br%2Ffotografia%2F2010%2F08%2F02%2F10270-970x600-1.jpeg&imgrefurl=http%3A%2F%2Ffotografia.folha.uol.com.br%2Fgalerias%2F535-enchentes-no-paquistao&h=600&w=970&tbnid=8teeWFF5xnn6jM%3A&zoom=1&docid=fZcIcN0M7jlH0M&ei=WGg-

۷

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Fwww.thenewstribe.com%2Fwp-content%2Fuploads%2F2013%2F05%2FPTI-in-Islamabad.gif&imgrefurl=http%3A%2F%2Fwww.siasat.pk%2Fforum%2Fshowthread.php%3F266429-Islamabad-ki-Taraf-Long-March-ki-Ijazat-Nahi-Milegi&h=427&w=640&tbnid=xZmn5aHkwHUC7M%3A&zoom=1&docid=n_KN6A175X_7HM&ei=UnE-VMSVIYbkaPqcgJgO&tbm=isch&ved=0CCEQMygZMBk4ZA&iact=rc&uact=3&dur=12&page=7&start=110&ndsp=20

۸

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Fwww.thenewstribe.com%2Fwp-content%2Fuploads%2F2013%2F05%2FPTI-in-Islamabad.gif&imgrefurl=http%3A%2F%2Fwww.siasat.pk%2Fforum%2Fshowthread.php%3F266429-Islamabad-ki-Taraf-Long-March-ki-Ijazat-Nahi-Milegi&h=427&w=640&tbnid=xZmn5aHkwHUC7M%3A&zoom=1&docid=n_KN6A175X_7HM&ei=UnE-VMSVIYbkaPqcgJgO&tbm=isch&ved=0CCEQMygZMBk4ZA&iact=rc&uact=3&dur=12&page=7&start=110&ndsp=20

۹

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Fmindennapi.hu%2Fupload%2Fpak2.jpg&imgrefurl=http%3A%2F%2Fmindennapi.hu%2Fcikk%2Fvilaghir%2Ftobb-oran-keresztul-alaztak-a-pakisztani-asszonyt%2F2011-06-

۱۰

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Fwww.pakpolicemag.com%2Fwp-content%2Fuploads%2F2011%2F09%2FWomen-Police-Pakistan.jpg&imgrefurl=http%3A%2F%2Fwww.seratnews.ir%2Ffa%2Fnews%2F62374%2F%25D8%25B9%25DA%25A9%25D8%25B3%25D8%25B2%25D9%2586%25D8%25A7%25D9%2586-%25D9%25BE%25D9%2584%25DB%258C%25D8%25B3-%25D8%25AF%25D8%25B1-%25DA%25A9%25D8%25B4%25D9%2588%25D8%25B1%25D9%2587%25D8%25A7%25DB%258C-%25D9%2585%25D8%25AE%25D8%25AA%25D9%2584%25D9%2581&h=282&w=450&tbnid=SzOFsTWbQdK7yM%3A&zoom=1&docid=fsglK6rQ-X4JTM&ei=vHA-VIfOA9HnaLKPgKAM&tbm=isch&ved=0CBsQMygAMAA&iact=rc&uact=3&dur=7&page=1&start=0&ndsp=10

۱۱

http://www.google.com.pk/imgres?imgurl=http%3A%2F%2Fnation.com.pk%2Fdigital_images%2F670%2F2014-07-18%2F1405672929-2900.jpg&imgrefurl=http%3A%2F%2Fnation.com.pk%2Fnational%2F18-Jul-2014%2Fclash-between-two-groups-of-pti-s-youth-wing-leaves-one-injured&h=441&w=670&tbnid=GtlEYcgKI2C00M%3A&zoom=1&docid=mWclbgcnD6uYhM&ei=t3Q-VJqCKMjYatSAgcAK&tbm=isch&ved=0CCUQMygMMAw&iact=rc&uact=3&dur=763&page=1&start=0&ndsp=15

ارشاد مستوئی ایوارڈ

انڈو یجوئل لینڈ پاکستان نے ارشاد مستوئی کی لازوال خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تنازعے پر رپورٹنگ کرنے والے صحافیوں کے لیے ایک ایوارڈ کا آغاز کیا ہے جس کا مقصد ان کے کام کی پذیرائی کرنا ہے۔ وہ صحافی جنہوں نے انڈو یجوئل لینڈ پاکستان کی تنازعاتی صحافت کی ورکشاپس میں حصہ لیا ہے انہیں تنازعے سے متعلق ایک شائع کردہ خبر مقابلے میں حصہ لینے کیلئے جمع کروانا ہوگی۔ یہ خبر کسی بھی اخبار، میگزین، رسالہ میں شائع یا کسی ٹی وی چینل پر اپریل ۲۰۱۴ کے بعد نشر ہونی چاہیے۔

مقابلے میں پہلے نمبر پر آنے والے کو دو لاکھ روپے کا انعام دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ دوسری اور تیسری پوزیشنیں حاصل کرنے والوں کو ایک ایک بلٹ پروف جیکٹ، ہیلمٹ اور فرسٹ ایڈ کِٹ بھی دی جائے گی۔ جیتنے والوں کا اعلان انڈو یجوئل لینڈ کی سالانہ قومی میڈیا کانفرنس کے دوران کیا جائے گا۔

ارشاد مستوئی جو ایک متحرک شخصیت کے مالک اور صوبہ بلوچستان کے بہترین صحافیوں میں شمار ہوتے تھے، ۲۵ فروری، ۱۹۷۹ کو ضلع جعفر آباد کے ایک ادبی اور سیاسی طور پر معروف گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ارشاد مستوئی نے ۲۰۰۰ء میں صحافت کی دنیا میں قدم رکھا اور اِس مدت میں انہوں نے مختلف اردو اور سندھی اخبارات اور ٹی وی چینلز کیلئے کام کیا۔ ۲۰۰۹ء میں اپنے صحافتی فرائض کی ادائیگی کے دوران پیش آنے والے ایک حادثے سے اُن کا سیدھا ہاتھ ضائع ہو گیا، البتہ یہ معذوری انہیں اپنے صحافتی فرائض سے الگ نا کرسکی۔ وہ اپنے مضامین کے ذریعے مختلف مسائل اجاگر کرتے رہے اور اپنے پیشے سے لگن کا ثبوت دیتے رہے۔ اپنی موت سے پہلے وہ کوئٹہ، بلوچستان میں آن لائن انٹرنیشنل نیوز انیٹورک کے لئے بیورو چیف کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اُن کا ماننا تھا کہ اگر الفاظ کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو یہ اِس دنیا میں تبدیلی کا باعث بن سکتے ہیں۔ اب جب کہ وہ ہم میں موجود نہیں اُن کے یہ الفاظ ہمیں ہمیشہ اُن کی یاد دلاتے رہیں گے، 'میں کچھ بھی نہیں مگر اپنے آپ میں کچھ ہوں بھی اور مجھے اپنے آپ اور اپنے الفاظ پر پورا اختیار ہے۔'

شکیاں

حکومت اور احتساب

نوجوانوں سے متعلق

لیاری میگزین

ادارے سے آگاہی

انڈویجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔ اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

انڈویجوئل لینڈ نے واضح طور پر قانون دانوں اور دیگر سول سوسائٹی اداروں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کیا ہے اور خصوصاً میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے حوالے سے اس کا نام پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے۔

اشاعت

میڈیا سے متعلق

تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

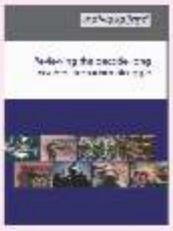

فرد میگزین

پاکستان پولیس خواتین

اگلی اشاعت مئی ۲۰۱۵ء میں

Find us
Individualland
Individualland